تدبّرِ قرآن

۱۷

بنی اسرائیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ، سابق سورہ ــــ سورۂ نحل ــــ کی، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، توام سورہ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، صرف تفصیل و اجمال کا فرق ہے۔ پچھلی سورہ میں جو باتیں اشارات کی شکل میں ہیں وہ اس سورہ میں نہایت واضح صورت میں آگئی ہیں۔ مثلاً۔

پچھلی سورہ میں مشرکین مکہ کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کے لیے دعوت اور انذار دونوں ہے لیکن جہاں تک بنی اسرائیل کا تعلق ہے بات صرف اشارات کی شکل میں ہے۔ اس سورہ میں تفصیل کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے، ان کی اپنی تاریخ کی روشنی میں، یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اگر تم اس غرے میں مبتلا ہو کر تم خدا کے محبوب اور چہیتے ہو تو یہ غرّہ محض خود فریبی پر مبنی ہے، تمھاری اپنی تاریخ شاہد ہے کہ جب جب تم نے خدا سے بغاوت کی ہے تم پر مار بھی بڑی ہی سخت پڑی ہے۔ خدا کی رحمت کے مستحق تم اسی صورت میں ہوئے ہو جب تم نے توبہ اور اصلاح کی راہ اختیار کی ہے تو اگر اپنی بہبود چاہتے ہو تو اس پیغمبرؐ کی پیروی کرو جو اسی سیدھی راہ کی دعوت دے رہا ہے جو تورات کے ذریعے سے تم پر کھولی گئی تھی۔ ساتھ ہی معراج کے واقعے کی طرف اشارہ کر کے مشرکین مکہ اور بنی اسرائیل دونوں پر یہ حقیقت بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ اب مسجد حرام اور مسجد اقصٰی دونوں کی امانت خائنوں سے چھین کر اس نبیِّ امی کے حوالہ کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے تو جس کو اپنی روش بدلنی ہے وہ بدلے ورنہ اپنی ضد اور سرکشی کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔

قرآن جس فطری اور سیدھے طریقۂ زندگی کی دعوت دے رہا ہے، پچھلی سورہ میں صرف، اس کی اساسات کی طرف اجمالی اشارہ تھا۔ اوامر میں عدل، احسان اور قرابت مندوں کے حقوق کی ادائی کا حوالہ تھا اور منہیات میں فحشاء، منکر اور بغی کا۔ اس سورہ میں اس کی پوری تفصیل آگئی ہے، اس تفصیل سے تورات کے احکام عشرہ کے ساتھ اس کی مطابقت واضح ہوتی ہے۔ گویا انسانی فطرت اور قدیم آسمانی تعلیم دونوں ہم آہنگ ہیں اس وجہ سے قریش اگر اس سے بغاوت کرتے ہیں تو ان کی بھی شامت ہے اور اگر بنی اسرائیل اس کے خلاف سازشیں کرتے ہیں تو ان پر بھی خدا کی پھٹکار ہے۔

پچھلی سورہ میں ہجرت کا ذکر بھی ہے لیکن اشارے کی شکل میں ہے۔ اس سورہ میں اس کا ذکر نہایت واضح طور پر ہوا ہے اور اس کے لیے جن تیاریوں کی ضرورت ہے ان کی ہدایت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے

صحابہؓ کو ایسے انداز میں دی گئی ہے جس سے یہ نمایاں ہو رہا ہے کہ اس کا وقت بہت قریب ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سورہ ہجرت کے قریب، زمانہ میں نازل ہوئی۔

سابق سورہ کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت واضح کرنے کے بعد اب ہم اس کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں تاکہ بالاجمال پوری سورہ نظر کے سامنے آجائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱) واقعہ معراج کی طرف اشارہ جس میں یہ حقیقت مضمر تھی کہ اب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں گھروں کی امانت خائنوں اور بدعہدوں سے چھین کر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کی گئی۔ اب یہی ان مقدس گھروں اور ان کے انوار و برکات کے وارث اور محافظ و امین ہوں گے اور ان کے قابضین ــــ مشرکین قریش اور یہود ــــ عنقریب ان گھروں کی تولیت سے بے دخل کیے جائیں گے۔

(۲-۸) تاریخ بنی اسرائیل کی روشنی میں ان کے اس زعم کی تردید کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے اب دنیا کی مذہبی پیشوائی ان کا اجارہ ہے۔ ان آیات میں ان پر واضح کیا گیا ہے کہ تمھیں خود تمھارے نبیوں کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ تم دو مرتبہ خدا سے بغاوت اور زمین میں فساد مچاؤ گے اور دونوں مرتبہ خوب خوب پٹو گے۔ چنانچہ تمھاری تاریخ شاہد ہے کہ تم نے دو مرتبہ خدا سے بغاوت کی اور دونوں ہی مرتبہ خوب پٹے، ایک مرتبہ کلدانیوں کے ہاتھوں اور دوسری مرتبہ رومیوں کے ہاتھوں، تمھیں کلدانیوں کے شکنجہ سے نجات اس وقت ملی جب تم نے اپنے حالات کی اصلاح کی۔ اسی طرح اگر آئندہ بھی تم خدا کی رحمت کے مستحق بننا چاہتے ہو تو توبہ اور اپنے حالات کی اصلاح کرو۔ اس نبی امی کی دعوت نے تمھارے لیے توبہ اور اصلاح کی راہ کھول دی ہے۔ اگر سلامتی چاہتے ہو تو اس دعوت کو قبول کرو اور اس کی برکات میں حصہ دار بن جاؤ۔ اگر تم نے حسد میں مبتلا ہو کر اس نبی کی تکذیب کر دی اور نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کے غرے میں مبتلا رہے تو یاد رکھو ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں، ہم تمھیں پھر اسی طرح پٹوائیں گے جس طرح اس سے پہلے پٹوا چکے ہیں۔

(۹-۲۱) مشرکین قریش اور بنی اسرائیل دونوں کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت کہ یہ قرآن فطرت کی اسی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کر رہا ہے جس کی طرف سابق انبیاء اور پچھلے صحیفوں نے رہنمائی کی ہے۔ ان کے لیے بشارت ہے جو اس کو قبول کریں اور ان کی شامت ہے جو اس کو رد کر دیں۔ ان لوگوں کی حالت پر افسوس جو اس دعوتِ حق کو قبول کرنے کے بجائے حسی معجزات اور عذاب کی نشانیاں مانگتے ہیں اور ان نشانیوں کی طرف توجہ نہیں کرتے جو آفاق میں بھی پھیلی ہوئی ہیں اور جن کی تفصیل اس کتاب میں بھی کر دی گئی ہے۔ یہ اپنے مزعومہ معبودوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں حالانکہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، ہر ایک کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا ہے۔ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انذار و تنبیہ کے بغیر عذاب نہیں بھیجتا۔ اب ان کو تنبیہ ہو چکی ہے، اگر انھوں نے اس تنبیہ

ہے۔ فائدہ نہ اٹھایا تو آگے عذاب ، ہی کا مرحلہ باقی ہے ۔ ساتھ ہی عذاب کے بارے میں سنتِ الٰہی کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

(۲۲-۳۹) قرآن جس طریق اقوم کی دعوت دے رہا ہے (جس کی طرف سورۂ نحل کی آیت ۹۰ میں اشارہ گزر چکا ہے) اس کی تفصیل ۔ یہ تفصیل واضح کرتی ہے کہ تورات کے احکام عشرہ اور قرآن حکیم کی ان ہدایات میں پوری مطابقت ہے اور یہ عین انسانی فطرت کے موافق ہیں جن کے بغیر کوئی صالح معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا اس وجہ سے نہ بنی اسرائیل کے لیے ان سے فرار کا کوئی جواز ہے نہ بنی اسمٰعیل کے لیے ۔ حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ تک سب نے انہی باتوں کی تعلیم دی ہے ۔

(۴۰-۵۲) مشرکین قریش کی قرآن سے بیزاری کے اصل سبب کی طرف اشارہ کہ وہ توحید اور آخرت پر ایمان نہیں لانا چاہتے اس وجہ سے جب ان کو قرآن سنایا جاتا ہے تو وہ اس سے بدکتے اور پیغمبرؐ پر طرح طرح کے فقرے چست کرتے ہیں حالانکہ ان دونوں باتوں کے دلائل اس قدر واضح ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا ۔

(۵۳-۵۵) یہ تین آیتیں اثنائے کلام میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں ۔ آپ کو یہ ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اپنے صحابہؓ کو متنبہ کر دیں کہ دعوت کی اس گرما گرمی کے دور میں ، تبلیغ حق کے جوش میں ، کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالیں جو مخالفین کے لیے مزید اشتعال کا سبب بن جائے اور شیطان اسے فتنہ کا ذریعہ بنا لے ۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمہارا فرض صرف تبلیغ حق تک محدود ہے لوگوں کو مومن و مسلم بنا دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے ، اللہ ہی جس کو چاہے گا ایمان کی توفیق دے گا اور جس کو چاہے گا اس سے محروم رکھے گا ۔ آیت ۵۵ میں یہ حقیقت واضح فرما دی گئی کہ اللہ نے اپنے تمام نبیوں کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اس وجہ سے کسی کے لیے مطلق ترجیح و تفضیل کی بحث نہ چھیڑی جائے کہ وہ وجہِ فتنہ بن جائے ۔

(۵۶-۵۷) التفات کی آیات بطور جملہ معترضہ تھیں ۔ ان کے ختم ہونے کے بعد توحید کے اس مضمون کی تکمیل کر دی گئی جو اوپر سے چلا آرہا تھا ۔ مشرکین ، فرشتوں کو خدا کا شریک مانتے تھے ۔ ان کی بابت فرمایا کہ خدا کا شریک ہونا تو الگ رہا وہ تو خود برابر خدا کے قرب اور اس کی رضا کے حصول کی جد و جہد میں سرگرم اور ہر وقت اس کے عذاب کے اندیشے سے لرزاں و ترساں ہیں ۔

(۵۸-۶۰) مخالفین کے مطالبۂ نشانیِ عذاب کا جواب اور اس باب میں سنتِ الٰہی کا بیان ۔

(۶۱-۶۵) مخالفین کے اعراض و انکار کے اصل سبب کی طرف اشارہ کہ اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا تو انھوں نے نعمت کو شکر کے بجائے کفر و استکبار کا سبب بنا لیا ۔ اس معاملے میں انھوں نے ٹھیک ٹھیک ابلیس کے نقشِ قدم کی پیروی کی ہے اور ابلیس نے ان کے باب میں اپنا گمان بالکل سچ کر دکھایا ۔

(۶۶-۷۲) نعمت پا کر انسان کے غرور و استکبار کی تمثیل اور آنکھیں کھول کر زندگی بسر کرنے والوں اور آنکھیں بند

کرکے بھٹکنے والوں کے انجام کا بیان۔

(۷۲-۷۷) مخالفین کی مخالفت کے علی الرغم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ حق پر جمے رہنے کی تاکید اور اس امر کا اعلان کہ اگر قریش نے تمھیں اس سرزمین سے نکال دیا تو پھر ان کو بھی یہاں زیادہ دیر تک ٹکنا نصیب نہ ہوگا۔ نبی کی ہجرت کے باب میں سنت الٰہی کی وضاحت۔

(۷۸-۸۱) حصولِ صبر و ثبات کے لیے نماز کے اہتمام کی تاکید۔ قربِ ہجرت کی طرف اشارہ اور اس کے لیے دعا کی تلقین۔ ظاہری حالات کے علی الرغم غلبۂ حق کی بشارت۔

(۸۲-۸۹) مخالفین کی حرماں نصیبی پر اظہارِ افسوس کہ وہ قرآن جیسی نعمتِ عظمیٰ کی ناقدری کر رہے ہیں حالانکہ یہ ان کے لیے شفا اور رحمت ہے اور تمام جن و انس مل کر بھی اگر ایسی کتاب لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔ ضمناً وحی اور جبریل سے متعلق مخالفین کا ایک معترضانہ سوال اور اس کا حکیمانہ جواب۔

(۹۰-۱۰۰) کفار کی طرف سے بعض معجزات کا مطالبہ اور ان کا جواب۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی کی طرف اشارہ۔ قریش کے متکبرین کو یہ تنبیہ کہ تم خدا کے خزائن نعمت کے ٹھیکے دار نہیں ہو کہ سمجھتے ہو کہ اگر نبوت کسی کو ملنے والی ہوتی تو تمھیں میں سے کسی کو ملتی۔ یہ اللہ کا فضل ہے اس نے جس کو چاہا دیا۔

(۱۰۱-۱۰۴) حضرت موسیٰؑ اور ان کے نو معجزات کا حوالہ۔ ان معجزات کے دیکھنے کے باوجود فرعون کی سرکشی اور اس کا انجام۔

(۱۰۵-۱۱۱) خاتمۂ سورہ —— قرآن یکسر حق ہے۔ رسول کی ذمہ داری صرف انذار و تبشیر ہے۔ قرآن کا بالتدریج اترنا تعلیم کے پہلو سے ہے۔ جو بدبخت اس پر ایمان نہیں لا رہے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ جن کے اندر علم کی روشنی ہے وہ اس پر ایمان لا رہے ہیں۔ اللہ اور رحمٰن سب خدا ہی کے نام ہیں۔ جو لوگ ان ناموں میں کوئی فرق کرتے اور ان کو بنائے اعتراض بناتے ہیں، ان کے درپے نہ ہو۔ اس دین کی روح میانہ روی ہے اور اس میانہ روی کو اپنی عبادات میں ملحوظ رکھو اور اللہ کی حمد اور اس کی تکبیر میں سرگرم رہو۔

اس تجزیۂ مطالب پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ ایک معین عمود کے تحت کس طرح اس سورہ کی ہر کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہے —— اب ہم توفیق الٰہی کی دعا کے ساتھ سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔

سُوْرَةُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۱۷)

مَکِّیَّةٌ —— اٰیَاتُهَا ۱۱۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیت ۱

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۱﴾

ترجمۂ آیت ۱

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو لے گئی ایک شب مسجد حرام سے اس دور والی مسجد تک جس کے اردگرد کو ہم نے برکت بخشی تا کہ ہم اس کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک سمیع و بصیر وہی ہے۔ ۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۱)

سُبْحٰنَ تنزیہ کا کلمہ ہے

'سُبْحٰنَ' جیسا کہ متعدد مواقع میں تصریح ہو چکی ہے، تنزیہ کا کلمہ ہے۔ یعنی اللہ کی ذات ہر نقص و عیب سے پاک و منزہ ہے۔ اس کلمہ سے کلام کا آغاز اس موقع پر کیا جاتا ہے جہاں مقصود خدا کے باب میں کسی سوئے ظن یا غلط فہمی کو رفع کرنا ہو۔ یہاں واقعۂ معراج کی تمہید اس لفظ سے اس لیے اٹھائی ہے کہ یہ واقعہ بھی خدا کے باب میں یہود اور مشرکین کے ایک بہت بڑے سوءِ ظن کو رفع کرنے والا تھا۔ یہ دونوں ہی گروہ خدا کے دین کے دو سب سے بڑے مرکزوں پر قابض تھے اور ان کو انھوں نے، ان کے بنیادی مقصد کے بالکل خلاف، نہ صرف شرک و بت پرستی کا اڈا بلکہ جیسا کہ سیدنا مسیحؑ نے فرمایا ہے کہ 'تم نے میرے باپ کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا ڈالا ہے'، ان کو انھوں نے چوروں اور خائنوں کا بھٹ ہی بنا ڈالا تھا۔ یہ دونوں ہی مقدس گھر بالکل خائنوں اور

بے ایمانوں کے تصرف میں تھے[1]۔ اور یہ ان میں اس طرح اپنی من مانی کر رہے تھے گویا ان گھروں کا اصل مالک کانوں میں تیل ڈال کر اور آنکھوں پر پٹی باندھے سو رہا ہے اور اب کبھی وہ اس کی خبر لینے کے لیے بیدار ہی نہیں ہوگا۔ معراج کا واقعہ، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا ہے، اس بات کی تمہید تھا، کہ اب ان گھروں کی امانت اس کے سپرد ہونے والی ہے جو ان کے اصلی مقصد تعمیر کو پورا کرے گا اس وجہ سے اس کے بیان کا آغاز سُبْحٰنَ کے لفظ سے فرمایا اور آیت کے آخر میں اپنی صفات اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ کا حوالہ دے کر یہ واضح فرمادیا کہ جو نادان خدا کو نعوذ باللہ اندھا اور بہرا سمجھے بیٹھے تھے اب وہ اپنے کان اور اپنی آنکھیں کھولیں۔ اب ان کی عدالت کا وقت آگیا ہے، حقیقی سمیع و بصیر خدا ہی ہے اور اب وہ اپنے کامل علم و خبر کی روشنی میں لوگوں کا انصاف کرے گا۔

'عبدہ' سے مراد آنحضرت صلعم

'اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا' اسراء کے معنی شب میں سفر کرنے کے ہیں اور جب 'ب' کے ذریعے سے یہ متعدی ہوجائے تو اس کے معنی شب میں کسی کو کہیں لے جانے کے ہیں۔ اگرچہ اس کے مفہوم میں شب میں نکلنے یا لے جانے کا مفہوم خود داخل ہے لیکن عام استعمال میں یہ لفظ کبھی کبھی اس مفہوم سے مجرد ہوجایا کرتا ہے اس وجہ سے ”لَيْلًا“ کی قید سے اس بات کو مؤکد کرنا مقصود ہے کہ یہ واقعہ شب ہی میں پیش آیا۔

'بِعَبْدِهٖ' میں 'عبد' سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس موقع پر حضورؐ کے لیے اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور کے غایت درجہ اختصاص، آپؐ کے ساتھ اللہ کی غایت درجہ محبت اور آپ کے کمال درجہ عبدیت کی دلیل ہے۔ گویا آپؐ کی ذات کسی اور تعریف و تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ لفظ عبد نے خود انگلی اٹھا کر ساری خدائی میں سے اس کو ممیز کردیا جو اس لفظ کا حقیقی محل و مصداق ہے۔

'مسجد حرام' اور 'مسجد اقصیٰ' سے مراد

'مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ' مسجد حرام سے تو ظاہر ہے کہ خانہ کعبہ مراد ہے۔ رہی دوسری مسجد تو اس کا تعارف دو صفتوں سے کرایا ہے۔ ایک 'اقصیٰ' دوسری 'الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ'۔ 'اقصیٰ' کے معنی ہیں دور والی۔ یہ مسجد حرم مکہ کے باشندوں سے، جو اس کلام کے مخاطب اول ہیں کم و بیش ۴۰ دن کی مسافت پر یروشلم میں تھی اس وجہ سے اس کو اقصیٰ کی صفت سے موصوف فرمایا تاکہ ذہن آسانی سے اس کی طرف منتقل ہوسکے۔ پھر 'الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ' کی صفت اس کے ساتھ لگا کر اس سرزمین کی طرف بھی اشارہ کردیا جس میں یہ مسجد واقع ہے۔ یہ اس سرزمین کی روحانی اور مادی دونوں قسم کی زرخیزیوں کی طرف اشارہ ہے۔ قدیم صحیفوں میں اس سرزمین کو دودھ اور شہد کی سرزمین کہا گیا ہے۔ جو اس کی انتہائی زرخیزی کی تعبیر ہے۔ روحانی برکات کے اعتبار سے اس کا جو درجہ تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ جتنے انبیاء کا مولد و مدفن ہونے کا شرف اس سرزمین کو حاصل ہوا ہے کسی دوسرے علاقے کو حاصل نہیں ہوا۔

---

[1] مسجد اقصیٰ کی حالت کا اندازہ کرنے کے لیے تو حضرت مسیحؑ کے الفاظ ہی کافی ہیں۔ اگر حرم ابراہیمی کی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو ہماری تفسیر سورۂ لہب پر ایک نظر ڈال لیجیے کہ ابولہب نے اس میں کیا اودھم مچا رکھی تھی۔

معراج کے سفر کی غایت

لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا یہ اس سفر کی غایت بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ اسلوب بیان کی یہ بلاغت ملحوظ رہے کہ اوپر کی بات غائب کے صیغہ سے بیان ہوئی ہے جو تفخیم شان پر دلیل ہے اور یہاں صیغہ متکلم کا آگیا ہے جو التفات خاص کو ظاہر کر رہا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے یہ سفر اس لیے کرایا تا کہ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ یہ نشانیاں کیا تھیں اس کا کوئی ذکر یہاں نہیں ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ آثار و مشاہد اور وہ انوار و برکات ہیں جن سے یہ دونوں ہی گھر معمور تھے۔ مقصود ان کے دکھانے سے ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی واضح ہو جائے کہ اب یہ ساری امانت ناقدروں اور بدعہدوں سے چھین کر آپ کے حوالے کی جانے والی ہے۔ گویا دعوت کے اس انتہائی مشکل دور میں آپ کو اللہ کی مدد و نصرت کی جو بشارت دی جا رہی تھی معراج کے اس سفر نے اس پر ایک مزید مہر تصدیق ثبت کر دی اور جو کچھ ہونے والا تھا وہ آپ کو دکھا بھی دیا گیا۔

نبی کی رویائے صادقہ

رہا یہ سوال کہ یہ جو کچھ آپ کو دکھایا گیا رویا میں دکھایا گیا یا بیداری میں تو اس سوال کا جواب اسی سورہ میں آگے قرآن نے خود دے دیا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔ ۶۰ — اور ہم نے اس رویا کو جو ہم نے تمھیں دکھائی لوگوں کے لیے فتنہ ہی بنا دی۔

ظاہر ہے کہ یہاں جس رویا کی طرف اشارہ ہے اس سے اس رویا کے سوا کوئی اور رویا مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے جس کا ذکر آیت زیر بحث میں لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا کے الفاظ سے ہوا ہے۔ لفظ 'اراءت' قرآن میں متعدد مقامات میں، رویا میں دکھانے کے لیے آیا بھی ہے اور مفسرین نے اس سے یہی رویا مراد بھی لی ہے۔ اس وجہ سے اس کا رویا ہونا تو اپنی جگہ پر واضح بھی ہے اور مسلم بھی لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ 'رویا' کو خواب کے معنی میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ خواب تو خواب پریشان بھی ہوتے ہیں لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام کو جو رویا دکھائی جاتی ہے وہ رویائے صادقہ ہوتی ہے اس کے متعدد امتیازی پہلو ہیں جو ذہن میں رکھنے کے ہیں۔

رویائے صادقہ کے امتیازی پہلو

پہلی چیز تو یہ ہے کہ رویائے صادقہ وحی الٰہی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں پر جس طرح فرشتے کے ذریعے سے کلام کی صورت میں اپنی وحی نازل فرماتا ہے اسی طرح کبھی رویا کی صورت میں بھی ان کی رہنمائی فرماتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ یہ رویا نہایت واضح، غیر مبہم اور روشن صورت میں کَفَلَقِ الصُّبْحِ ہوتی ہے جس پر نبی کو پورا شرح صدر اور اطمینان قلب ہوتا ہے۔ اگر اس میں کوئی چیز تمثیلی رنگ میں بھی ہوتی ہے تو اس کی تعبیر بھی اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر واضح فرما دیتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ جہاں واقعات و حقائق کا مشاہدہ کرانا مقصود ہو وہاں یہی ذریعہ نبی کے لیے زیادہ اطمینان بخش ہوتا ہے اس لیے کہ اس طرح واقعات کی پوری تفصیل مشاہدہ میں آجاتی ہے اور وہ معانی و حقائق

بھی ممثل ہو کر سامنے آجاتے ہیں جو الفاظ کی گرفت میں مشکل ہی سے آتے ہیں۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ رویا کا مشاہدہ چشم سر کے مشاہدہ سے زیادہ قطعی، زیادہ وسیع اور اس سے ہزارہا درجہ عمیق اور دوررس ہوتا ہے۔ آنکھ کو مغالطہ پیش آسکتا ہے لیکن رویائے صادقہ مغالطہ سے پاک ہوتی ہے، آنکھ ایک محدود دائرہ ہی میں دیکھ سکتی ہے لیکن رویا بیک وقت نہایت وسیع دائرہ پر محیط ہو جاتی ہے، آنکھ حقائق و معانی کے مشاہدے سے قاصر ہے، اس کی رسائی مرئیات ہی تک محدود ہے۔ لیکن رویا معانی و حقائق اور انوار و تجلیات کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے تجلی الٰہی اپنی آنکھوں سے دیکھنی چاہی لیکن وہ اس کی تاب نہ لا سکے۔ برعکس اس کے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں جو مشاہدے کرائے گئے وہ سب آپؐ نے کیے اور کہیں بھی آپ کی نگاہیں خیرہ نہیں ہوئیں۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ کا موقع و محل اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ اس کے اندر حصر کا پہلو ہے۔ وہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ حقیقی سمیع و بصیر خدا ہی ہے۔ اس کے سمع و بصر سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے۔ اگر دوسروں کو اس میں سے کوئی حصہ ملا ہے تو وہ خدا ہی کا عطا کردہ اور نہایت محدود ہے۔ مقصود ان صفات کا حوالہ دینے سے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، مشرکین قریش اور بنی اسرائیل دونوں کو متنبہ کرنا ہے کہ خدا کو اپنی کرتوتوں سے بے خبر نہ سمجھو، وہ ہر چیز کو دیکھ اور سن رہا ہے۔

۲- آگے کا مضمون —— آیات ۲-۸

یہود کے کبر و غرور پر ضرب

آگے کی آیات میں یہود کے اس غرور پر ضرب لگائی گئی ہے کہ وہ اسرائیل کی اولاد اور خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس وجہ سے مذہبی پیشوائی ان کا اجارہ ہے۔ یہود اپنے اس غرور کے سبب سے اول تو اپنے خاندان سے باہر کسی کی نبوت و رسالت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شروع ہی سے شدید مخالف تھے، پھر جب آپؐ نے شب معراج کے مشاہدات بیان کیے اور وہ ان کے علم میں آئے تو ان کا پارہ اور چڑھ گیا کہ یہ لو، یہ شخص ہمارے نبیوں کی وراثت اور ہماری امامت کا بھی مدعی بن بیٹھا۔ قرآن نے ان کے دماغ سے یہ ہوا نکالنے کے لیے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کا استحقاق کسی قوم کو بھی نسل و نسب کی بنا پر حاصل نہیں ہوتا بلکہ ایمان و عمل صالح کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ اور اس پر خود انہی کی تاریخ کی شہادت پیش کی ہے کہ خود تمہارے صحیفوں میں ہے کہ تم دو مرتبہ بڑے پیمانہ پر خدا سے بغاوت کرو گے اور زمین میں فساد مچاؤ گے اور دونوں مرتبہ خدا تم پر اپنے سخت گیر بندے مسلط کرے گا جو تمہارا کچومر نکال دیں گے۔ چنانچہ یہ پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئیں۔ جب تم نے اصلاح کی ہے خدا نے تم پر رحمت کی ہے اور جب تم نے فساد مچایا ہے خدا نے تم پر اپنے عذاب کے کوڑے برسائے ہیں۔ یہی مرحلہ اس وقت بھی تمہارے سامنے ہے۔ ہمارے رسول کی دعوت نے تمہارے لیے صلاح و فلاح کی

راہ کھول دی ہے۔ اگر تم نے یہ دعوت قبول کر لی تو اس کی برکتوں میں برابر کے حصہ دار ہوگے اور اگر تم نے یہ دعوت رد کر دی تو یاد رکھو کہ ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں، ہم پھر تمہاری اسی طرح خبر لیں گے جس طرح اس سے پہلے لے چکے ہیں۔ آیات تلاوت کیجیے۔

آیات ۲-۸

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝۲ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝۴ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝۶ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝۷ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝۸

وقف لازم

ترجمۂ آیات ۲-۸

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت نامہ بنایا کہ میرے سوا کسی کو معتمد نہ بنائیو، اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کرایا، بیشک وہ ایک شکر گزار بندہ تھا۔ ۲-۳

اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں

فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے۔ پس جب ان میں سے پہلی بار کی میعاد آجاتی ہے تو ہم تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں تو وہ گھروں میں گھس پڑے اور شدنی وعدہ پورا ہو کے رہا۔ پھر ہم نے تمھاری باری ان پر لوٹائی اور تمھاری مال اور اولاد سے مدد کی اور تمھیں ایک کثیر التعداد جماعت بنا دیا۔ اگر تم بھلے کام کرو گے تو اپنے لیے کرو گے اور اگر برے کام کرو گے تو بھی اپنے ہی لیے۔ پھر جب پچھلی بار کی میعاد آجاتی ہے تو ہم تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں کہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور تاکہ وہ مسجد میں گھس پڑیں جس طرح پہلی بار گھس پڑے تھے اور تاکہ جس چیز پر ان کا زور چلے اسے تہس نہس کر ڈالیں۔ کیا عجب کہ تمھارا رب تم پر رحم فرمائے اور اگر تم پھر وہی کرو گے تو ہم بھی وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو تو کافروں کے لیے باڑا بنا ہی رکھا ہے۔ ۴-۸

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا (۲)

'وکیل' کے معنی کارساز اور معتمد

'کتاب' سے مراد تورات ہے اور 'وکیل' کے معنی کارساز، معتمد اور اس ذات کے ہیں جس پر کامل بھروسہ کر کے اپنے معاملات اس کے حوالہ کر دیے جائیں۔

یہود کے بگاڑ کی تاریخ

یہ آیت تمہید ہے یہود کے اس بگاڑ اور فساد کے بیان کی جو آگے کی آیات میں آرہا ہے۔ فرمایا کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے صحیفۂ ہدایت بنایا جس میں صاف یہ ہدایت درج تھی کہ میرے سوا کسی کو کارساز اور معتمد نہ بنائیو۔ مقصود اس کا حوالہ دینے سے یہ واضح کرنا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس اہتمام ہدایت کی کوئی قدر نہیں کی۔ اس کے صحیفۂ ہدایت کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا اور شرک سے بچتے رہنے کی صریح ہدایت کے باوجود شرک کی نجاستوں اور آلودگیوں میں مبتلا ہوئے۔

تورات میں توحید کی تعلیم

کتاب کے ذکر کے بعد توحید کی تعلیم کا حوالہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہی چیز تمام تعلیمات دین کے لیے مرکزِ ثقل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی پر تمام شریعت کی بنیاد بھی ہے اور اسی کے ساتھ وابستہ رہنے تک کوئی جماعت دین سے وابستہ بھی رہتی ہے۔ جہاں اس مرکزِ ثقل سے وابستگی کمزور ہوئی پھر بالتدریج سارا دین غارت

ہو کے رہ جاتا ہے۔

یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ تورات توحید کی تعلیم سے بھری پڑی ہے۔ حوالے نقل کرنے میں طوالت ہوگی اس وجہ سے ہم صرف ایک حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ خروج - ۲ : ۲۰ میں ہے۔

”خداوند تیرا خدا جو تجھے زمین مصر سے غلامی کے گھر سے نکال لایا میں ہوں۔ میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے۔ تو اپنے لیے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے سے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں۔“

قرآن کے الفاظ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا اور تورات کے الفاظ ”میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے“ میں کتنی مطابقت ہے لیکن ان واضح ہدایات کے باوجود یہود بار بار شرک و بت پرستی میں مبتلا ہوئے جس پر ان کے نبیوں نے نہایت دردانگیز الفاظ میں ماتم بھی کیا ہے اور یہود کو ملامت بھی کی ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے تو یہود کو مخاطب کر کے یہاں تک فرما دیا کہ ”تو وہ ہے کہ تو نے پہلی شب میں چھنالا کیا۔“

ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (۳)

حرف ندا یہاں محذوف ہے۔ یعنی توحید کی اس تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کو یہ یاد دہانی بھی کر دی گئی تھی کہ اس بات کو ہمیشہ مستحضر رکھنا کہ تم ان باقیات الصالحات کی نسل سے ہو جن کو اللہ نے نوحؑ کے ساتھ ان کی کشتی میں بچایا۔ نوحؑ اللہ کے ایک شکر گزار بندے تھے تو تم بھی انہی کی طرح خدا کے شکرگزار اور اس کی توحید پر قائم رہنا ورنہ یاد رکھو کہ جس طرح اللہ نے قوم نوحؑ کے وجود سے اس کے شرک کی پاداش میں، اپنی زمین کو پاک کر دیا اسی طرح تمہارے وجود سے بھی اپنی زمین کو پاک کر دے گا۔

وَقَضَیْنَاۤ اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِیْرًا (۴)

عربیت کا ایک اسلوب

’قَضَیْنَا‘ کے بعد ’اِلٰی‘ کا صلہ عربیت کے قاعدے سے اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں ’اَبْلَغْنَا‘ یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے۔ یعنی ہم نے فیصلہ کر کے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔

یہود کے دو بڑے فسادات

’فِی الْكِتٰبِ‘ میں ’الکتاب‘ کا لفظ یہاں تمام اسفار یہود پر مشتمل ہے۔ قرآن میں یہ لفظ تورات کے لیے بھی آیا ہے اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں کے لیے بھی۔ آیت میں یہود کے جن دو بڑے فسادات اور ان کے انجام کی خبر دی گئی ہے ان میں سے پہلے فساد اور اس کے عبرت انگیز انجام سے حضرت داؤد، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل علیہم السلام نے آگاہ فرمایا اور دوسرے فساد اور اس کے عواقب سے سیدنا مسیحؑ نے ڈرایا۔ ’فساد‘ سے مراد جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں، خدا کی توحید اور اس کی شریعت سے بغاوت ہے۔ اس قسم کے فسادات سے یوں تو یہود کی پوری تاریخ بھری پڑی ہے چنانچہ ایک فساد کی تفصیل سورۂ بقرہ میں تابوت کے چھن جانے کے واقعہ سے متعلق بھی گزر چکی ہے لیکن

یہاں جن فسادات کا حوالہ ہے وہ ایسے فسادات ہیں کہ ان کے نتائج نے یہود کی پوری قوم کو ذلیل و پامال کر کے رکھ دیا۔ حضرت داؤدؑ نے پہلے فساد اور اس کے انجام کی جن لفظوں میں پیشین گوئی فرمائی تھی وہ یہ ہیں۔

انھوں نے (یعنی بنی اسرائیل نے) ان قوموں کو (یعنی مشرک قوموں کو) ہلاک نہ کیا، جیسا کہ خداوند نے ان کو حکم دیا تھا بلکہ ان قوموں کے ساتھ مل گئے اور ان کے سے کام سیکھ گئے اور ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگے جو ان کے لیے پھندا بن گئے بلکہ انھوں نے اپنی بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا یعنی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا خون بہایا .... اس لیے خدا کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث سے (یعنی بنی اسرائیل سے) نفرت ہو گئی اور اس نے ان کو قوموں کے قبضے میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمران بن گئے۔

زبور باب ۱۰۶ آیات ۳۴-۴۱

دوسرے فساد کی پیشین گوئی کے سلسلہ میں سیدنا مسیحؑ کے الفاظ یہ ہیں۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے۔"

متی باب ۲۴ آیت ۲

لوقا میں ہے۔

"اے یروشلم کی بیٹیو! میرے لیے نہ روؤ بلکہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے روؤ کیونکہ دیکھو وہ دن آتے ہیں جب کہیں گے کہ مبارک ہیں بانجھیں اور وہ پیٹ جو نہ جنے اور وہ چھاتیاں جنھوں نے دودھ نہ پلایا۔ اس وقت وہ پہاڑوں سے کہنا شروع کریں گے کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہیں گے کہ ہمیں چھپا لو۔"

باب ۲۳ آیات ۲۸-۳۰

آیت کے آخر میں فَنُعَذِّبُكُمْ مَرَّتَيْنِ یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے اور ہم دونوں مرتبہ تم کو سخت سزا دیں گے۔ چونکہ یہ بات بالکل واضح بھی تھی نیز اس کی پوری تفصیل آگے والی آیات میں آ رہی تھی اس وجہ سے یہاں اس کو حذف فرما دیا۔

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا (۵)

'اِذَا' صرف مستقبل ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ بیان عادت و سنت اور بعض اوقات تصویر حال کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں تصویر حال ہی کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمے میں اس کو ملحوظ رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چنانچہ دیکھو جب پہلی بار کی میعاد آ جاتی ہے تو ہم تمھیں اپنے عذاب کا مزا چکھانے کے

لیے اپنے زورآور بندوں کو ابھار کر تم پر مسلط کر دیتے ہیں جو تمھارے گھروں میں گھس پڑتے ہیں اور خدا کا شدنی وعدہ پورا ہو کے رہتا ہے۔

'بعث' کا صلہ جب 'علیٰ' کے ساتھ آتے تو وہ ابھارنے اور اکسانے کے ساتھ ساتھ مسلط کر دینے کے مفہوم پر بھی متضمن ہو جاتا ہے۔

یہود کی توہین و تذلیل کی تصویر

'فَجَاسُوا خِلٰلَ الدِّیَارِ' یہ یہود کی انتہائی توہین و تذلیل کی تصویر ہے اس لیے کہ جب دشمن اتنا زورآور ہو کہ وہ گھروں کے اندر گھس پڑے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے عزت و ناموس ہر چیز کو تاراج کر کے رکھ دیا۔ یہاں صرف اتنے ہی کے ذکر پر اکتفا فرمایا ہے اس لیے کہ ذلت کی تصویر کے لیے یہی کافی تھا لیکن آگے اس بات کا حوالہ بھی آئے گا کہ اس دشمن نے صرف گھروں میں گھسنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ مسجد اقصیٰ کی حرمت بھی پوری طرح برباد کی۔

بخت نصر کا حملہ اور یہود کی غلامی

یہ اشارہ بابل و نینوا کے بادشاہ بخت نصر یا نبوکد نفر کے حملہ کی طرف ہے جس نے ۵۸۶ قبل مسیح میں یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔

یرمیاہ نبی نے اس کی پیشین گوئی یوں فرمائی تھی۔

"رب الافواج یوں کہتا ہے۔ اس لیے کہ تم نے میری باتیں نہ سنیں دیکھ میں اتر کے سارے گھرانوں کو اپنے خدمت گزار شاہ بابل نبوکد نفر کو بلا بھیجوں گا۔"

یرمیاہ ۲۵ : ۸-۹

ان کے انذار کی مزید تفصیل سنیے۔

"میں ایسا کروں گا کہ ان کے درمیان خوشی کی آواز اور خرمی کی آواز، دولہے کی آواز دلہن کی آواز، چکی کی آواز اور چراغ کی روشنی باقی نہ رہے اور یہ ساری سرزمین ویرانہ اور حیرانی کا باعث ہو جائے گی اور یہ قومیں ستر برس تک بابل کے بادشاہ کی غلامی کریں گی۔"

یرمیاہ ۲۵ : ۹-۱۰

یرمیاہ نبی کا نوحہ سنیے:

"خداوند نے صیہون کی بیٹی کو اپنے قہر کے ابر تلے چھپا دیا۔ اس نے اسرائیل کے جمال کو آسمان سے زمین پر پٹک دیا اور اپنے قہر کے دن اپنے پاؤں رکھنے کی کرسی کو یاد نہ کیا۔ خداوند نے یعقوب کے سارے مکانوں کو غارت کیا اور رحم نہ کیا۔ اس نے اپنے قہر میں یہوداہ کی بیٹی کے قلعوں کو ڈھا دیا۔ اس نے انھیں خاک کے برابر کر دیا۔ اس نے بادشاہت اور امیروں کو ناپاک کیا۔ اس نے اپنے قہر شدید میں اسرائیل کا ہر ایک سینگ بالکل کاٹ ڈالا۔"

یرمیاہ کا نوحہ ۲ : ۱-۳

آیت میں بخت نصر (یا نبوکدنضر) اور اس کی فوجوں کے لیے عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ (اپنے زور آور بندے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ ان کے دین اور تقویٰ کے اعتبار سے نہیں استعمال ہوئے ہیں بلکہ صرف اس حیثیت سے استعمال ہوئے ہیں کہ انھوں نے خدا کے ارادہ کے اجرا و نفاذ کے لیے آلہ و جارحہ کا کام دیا۔ یہ اگرچہ خود گندے تھے لیکن گندگی کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو صاف کرنے میں انھوں نے مشیت الٰہی کی تنفیذ کی اس وجہ سے انھیں بھی فی الجملہ خدا سے نسبت حاصل ہوگئی۔ بنی اسرائیل کو غرہ تھا کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (ہم خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ خدا نے ان پر واضح کر دیا کہ جن جوتوں سے تم پٹے ہو وہ تو خدا کی نظروں میں کچھ وقعت رکھتے ہیں لیکن تم کوئی وقعت نہیں رکھتے۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا (۶)

ایک عرصہ کی غلامی اور بدحالی کے بعد بنی اسرائیل میں کچھ اصلاح حال کا جذبہ ابھرا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی طرف توجہ فرمائی، ان کے مال و اولاد میں برکت دی اور تائید الٰہی ان کے لیے اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ دارائے اول سائرس شاہ ایران نے ۵۳۹ ق، م میں کلدانیوں کو شکست دے کر ان کے ملک پر قبضہ کر لیا اور یہود کو جلا وطنی سے نجات دے کر وطن جانے اور اسے دوبارہ آباد کرنے کی اجازت دے دی، جس کے بعد بنی اسرائیل کو از سر نو خاصا فروغ حاصل ہوا۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ قف وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ط فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا (۷)

ٹائٹس کے ہاتھوں یہود کی دوسری تباہی

'اِنْ اَحْسَنْتُمْ .... الاٰیۃ' یعنی ایک طویل غلامی کے بعد یہ جو نجات حاصل ہوئی تھی اس کے اندر خود یہ درس مضمر تھا کہ اب اگر تم بھلائی کی روش اختیار کروگے تو اس کا نفع خود اپنے ہی کو پہنچاؤگے اور اگر پھر وہی سرکشی کی روش اختیار کروگے تو اس کا انجام بھی ویسا ہی بھگتوگے۔ یہ نوشتہ دیوار بھی موجود تھا اور اس سے تمہارے نبیوں نے بھی تمہیں اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا لیکن ہوا وہی جس کی پیشین گوئی پہلے ہو چکی تھی یعنی تم اسی طرح کے فساد میں پھر مبتلا ہو گئے جس طرح کے فساد میں پہلے مبتلا ہوئے تھے چنانچہ جب تمہاری سرکوبی کی دوسری میعاد آجاتی ہے تو ہم تم پر اپنے دوسرے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور تاکہ یہ بھی مسجد میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے والے گھس گئے تھے اور تاکہ یہ ہر اس چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیں جس پر ان کا زور چلے۔

'لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ' سے پہلے 'بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ' کے الفاظ محذوف ہیں۔ چونکہ اس کا قرینہ واضح تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور 'لِيَسُوْٓءٗا' پر جو لام ہے وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہا ہے۔

بائیبل ہسٹری کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس تباہی کی طرف اشارہ ہے جو سنہ میں رومی شاہنشاہ طیطاؤس (ٹائیٹس) کے ہاتھوں یہود پر آئی، جس کی طرف حضرت مسیحؑ نے اشارہ فرمایا تھا۔

عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ ۚ وَ اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا ۘ وَ جَعَلۡنَا جَہَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ حَصِیۡرًا (۸)

"حَصِیۡرًا" کا ٹھیک ترجمہ باڑا ہے جس میں جانوروں کو بند کرتے ہیں۔

نبی صلعم کی یہود کے لیے نجات

یہ ان یہود سے خطاب ہے جو ان آیات کے نزول کے وقت موجود اور قرآن کی مخالفت میں کفار قریش کی ہمنوائی و پشت پناہی کر رہے تھے۔ ان سے خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے وہ تمہیں سنایا جا چکا۔ اب اگر خیریت چاہتے ہو تو اس نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت نے تمہارے لیے نجات کی جو راہ کھولی ہے، اس کو اختیار کرو، اور اپنے مستقبل کو سنوار لو۔ اگر تم نے توبہ اور اصلاح کی راہ اختیار کر لی تو خدا بھی تم پر رحم فرمائے گا اور اگر تم نے پھر اسی طرح کی حرکتیں کیں جیسی کہ پہلے کرتے آئے ہو تو ہم بھی تمہاری اسی طرح خبر لیں گے جس طرح پہلے لے چکے ہیں اور یہ بھی یاد رکھو کہ اس دنیا میں جو ذلت و رسوائی ہوئی ہے وہ تو ہو گی ہی۔ آگے تمہارے جیسے کافروں کے لیے جہنم کا باڑا ہے جس میں سارے کے سارے بھر دیے جائیں گے۔

اس آیت کے تیور لحاظ رکھنے کے قابل ہیں۔ پہلے تو بات غائب کے صیغے سے فرمائی۔ پھر "وَ اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا" میں متکلم کا صیغہ آگیا۔ پہلے ٹکڑے میں بے پروائی کا انداز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ صحیح راہ اختیار کر لو گے تو اپنے ہی کو نفع پہنچاؤ گے اور اگر نہ اختیار کرو گے تو اپنی ہی شامت کو دعوت دو گے، خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔ دوسرے ٹکڑے میں نہایت ہی سخت وعید ہے اس وجہ سے اول تو متکلم کا صیغہ آیا جو تہدید و وعید کے لیے زیادہ موزوں ہے پھر اس میں ابہام و اجمال بھی ہے، یہ تو بتایا کہ ہم لوٹیں گے، یہ نہیں بتایا کہ ہم کس شکل میں لوٹیں گے۔ یہ بات سمجھنے والوں کی سمجھ پر چھوڑ دی ہے اور اس جملے کی ساری شدت اس ابہام کے اندر مضمر ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۹-۳۱

آگے کی آیات میں مشرکین قریش اور یہود دونوں کو اس قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے جو فطرت کی اسی صراط مستقیم کی دعوت دے رہا ہے جس کی دعوت تمام انبیاءؑ نے دی ہے۔ اس دعوت پر ایمان لانے والوں اور اس کی تکذیب کرنے والوں، دونوں کا انجام واضح فرما دیا گیا ہے اور ان لوگوں کو ملامت کی گئی ہے جو آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیوں اور قرآن کی واضح آیات سے آنکھیں بند کیے ہوئے عذاب کی نشانیوں کا مطالبہ کر رہے

ہیں۔ اسی ذیل میں بالاجمال اس سنت الٰہی کی وضاحت کر دی گئی ہے جو قوموں کو عذاب دینے کے معاملے میں
اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمائی ہے ۔۔۔ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۹-۲۱

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ
يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ﴿۹﴾ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۰﴾ وَيَدْعُ
الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾
وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ
اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ
السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾ وَكُلَّ
اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ
حَسِيْبًا ﴿۱۴﴾ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا
يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ
حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا
فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَكَمْ
اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ
خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا
نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا

ع ۱۰ ۱

مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

ترجمہ آیات ۹-۲۱

بے شک یہ قرآن اس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ہم نے ان کے لیے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۹-۱۰

اور انسان برائی کا اس طرح طالب بنتا ہے جس طرح اس کو بھلائی کا طالب بننا چاہیے اور انسان بڑا ہی جلد باز ہے اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، سو ہم نے رات کی نشانی تو دھندلی کر دی اور ہم نے دن کی نشانی کو روشن بنایا تاکہ تم اپنے رب کے فضل کے لیے کوشش کرو اور تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب معلوم کر سکو اور ہم نے ہر چیز کی پوری پوری تفصیل کر دی ہے۔ ۱۱-۱۲

اور ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کے گلے کے ساتھ باندھ دیا ہے اور ہم قیامت کے روز اس کے لیے ایک رجسٹر نکالیں گے جس کو وہ بالکل کھلا ہوا پائے گا۔ لو، پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود ہی اپنا حساب کر لینے کے لیے کافی ہو۔ جو ہدایت کی راہ چلتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے ہدایت کی راہ چلتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ہی اوپر وبال لاتا ہے اور کوئی

جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی اور ہم عذاب دینے والے نہیں تھے جب تک کسی رسول کو بھیج نہ لیں۔ ۱۲-۱۵

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے خوش حالوں کو امر کر دیتے ہیں تو وہ اس میں خوب اودھم مچاتے ہیں۔ پس ان پر بات پوری ہو جاتی ہے پھر ہم اس کو یکقلم نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اور نوح کے بعد ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں اور تمہارا رب اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر رہنے اور ان کو دیکھنے کے لیے کافی ہے۔ ۱۶-۱۷

جو دنیا ہی کا طالب بنتا ہے ہم اس کے لیے اسی میں جس قدر چاہتے ہیں، جس کے لیے چاہتے ہیں آگے بڑھا دیتے ہیں۔ پھر ہم نے اس کے لیے جہنم رکھ چھوڑی ہے جس میں وہ خوار اور راندہ ہو کر داخل ہو گا۔ اور جو آخرت کا طالب بنتا ہے اور اس کے شایانِ شان کوشش بھی کرتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو درحقیقت یہی لوگ ہیں جن کی سعی مقبول ہو گی۔ ہم تیرے پروردگار کی بخشش سے ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی بھی اور ان کی بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ دیکھو ہم نے ان کے ایک کو دوسرے پر کس طرح فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت درجات اور فضیلت کے اعتبار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ۱۸-۲۱

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۹-۱۰)

اَقْوَمُ کا مفہوم — اَقْوَمُ کے معنی سیدھا اور مستقیم یعنی وہ راستہ جو ٹھیک فطرت اور عقل کے مطابق اور خدا تک پہنچنے اور پہنچانے والا ہے۔

یہود اور مشرکین کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت

یہ بنی اسرائیل اور مشرکین قریش دونوں کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت ہے کہ اگر خدا تک پہنچنا چاہتے ہو تو پیچ پیچ کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے اس راستہ کو اختیار کرو جس کی طرف قرآن بلا رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کو اجرِ عظیم کی خوش خبری دیتا ہے جو اس پر ایمان لا کر عملِ صالح کی زندگی اختیار کریں۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کے سبب سے اس قرآن کو بھی ٹھکرا رہے ہیں ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔

وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا (۱۱)

یہ حالت انہی مخالفینِ قرآن کی بیان ہوئی ہے جو اس پر ایمان لانے کے بجائے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ مطالبہ چونکہ نہایت احمقانہ اور خود ان کے حق میں نہایت مہلک تھا اس وجہ سے بات ان سے منہ پھیر کر عام الفاظ میں بانداز تاسف فرما دی گئی کہ انسان کا عجیب حال ہے کہ جس سرگرمی کے ساتھ اس کو خیر کا طالب ہونا چاہیے اس سرگرمی کے ساتھ وہ اپنے لیے آفت اور تباہی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ مہلت جو ان لوگوں کو ملی ہوئی ہے اس سے فائدہ اٹھانے اور اپنی زندگی کو بنانے سنوارنے کے بجائے یہ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد اس عذاب ہی کو دیکھ لیں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔

وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ ۖ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا (۱۲)

اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ کے بعد مُظْلِمَةً لِّتَسْتَرِيحُوا یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہیں جن پر بعد کے الفاظ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ روشنی ڈال رہے ہیں۔ یعنی ہم نے شب کو تاریک بنایا تاکہ تم اس میں راحت حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں خدا کے رزق و فضل کے طالب بنو۔

عذاب کی نشانی کے طالبوں کے لیے آفاقی نشانیاں

یہ عذاب کی نشانی مانگنے والوں کو آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر نشانی ہی مطلوب ہے تو کیا ضرور ہے کہ کوئی عذاب ہی کی نشانی آئے آخر یہ رات اور رات کے بعد دن کے طلوع کو کیوں نہیں دیکھتے کیا یہ کچھ کم نشانی ہے؟ رات آتی ہے تو تمہارے لیے راحت اور سکون کا بستر بچھا دیتی ہے جس میں تم دن کے تھکے ماندے آرام کرکے از سرِ نو چاق و چوبند ہو جاتے ہو اسی لیے خدا نے اس کو تاریک اور پرسکون بنایا ہے۔ پھر دن آتا ہے جس میں تم تازہ دم ہو کر اپنی معاشی سرگرمیوں اور خدا کے رزق و فضل کی طلب میں سرگرم ہوتے ہو چنانچہ اسی لیے تمہارے پروردگار نے اس کو روشن بنایا ہے۔

وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ۔ روز و شب کی یکے بعد دیگرے، پابندیٔ اوقات کے ساتھ، آمد شد کا یہ ایک مزید فائدہ بتا دیا کہ اس طرح تم مہینوں اور سالوں کا حساب بھی معلوم کر لیتے ہو اور دوسرے حساب بھی جان لیتے ہو۔ اگر یہ روز و شب کا فرق نہ ہوتا تو آخر کسی چیز کے تعین کے لیے تم نشان اور علامتِ امتیاز کس چیز کو ٹھہراتے۔

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا۔ یعنی آفاق کی ان نشانیوں کے علاوہ ہم نے تم پر یہ احسان بھی کیا ہے کہ

اپنی اس کتاب میں بھی ہر ضروری چیز کی تفصیل کر دی ہے تاکہ غور کرنے والے کے اطمینان کے لیے یہ کتاب ہی کافی ہو جائے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رات اور دن کی آمد و شد سے جس حقیقت کی طرف یہاں توجہ دلائی گئی ہے قرآن نے صرف اسی پر بس نہیں کیا ہے بلکہ دوسرے مقامات پر اس کے مزید پہلو واضح فرمائے ہیں، مثلاً تضاد کے باوجود ان کے درمیان جو توافق ہے اس سے توحید پر استدلال کیا ہے، رات کے بعد صبح کی آمد سے حشر و نشر کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان چیزوں کی تفصیل پیچھے بھی اس کتاب میں گزر چکی ہے اور آگے بھی ان کی تفصیلات آئیں گی۔

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا ۝ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ‎(۱۳-۱۴)

'طائر' کا مفہوم 'طائر' کے اصل معنی تو پرندے کے ہیں لیکن اہل عرب پرندوں سے چونکہ فال بھی لیتے تھے اور اپنے زعم کے مطابق ان سے قسمت بھی معلوم کرتے تھے اس وجہ سے یہ لفظ قسمت، حظ اور نصیبہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

یہ عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو تنبیہ ہے کہ اگر یہ جلدی یہ اپنے مزعومہ شرکا و شفعاء کے بل پر مچائے ہوئے ہیں تو انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہم نے ہر انسان کا نصیبہ اس کی گردن کے ساتھ لٹکا رکھا ہے جس نے جو کچھ کیا ہوگا اس کی پوری تفصیل ایک کھلے ہوئے رجسٹر کی صورت میں اس کے سامنے موجود ہوگی اور ہم اس سے کہیں گے کہ تم اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لو، تم اپنے حساب کے لیے خود ہی کافی ہو، اس میں کسی اور کی دخل اندازی کی ضرورت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حساب کے دن کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ ہر ایک کے اعمال اس کے سامنے ہوں گے اور ہر ایک کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا ہوگا۔

مَّنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ‎(۱۵)

اتمام حجت کے لیے رسول کی بعثت یہ اوپر کے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا اپنے ہی نفع کے لیے کرے گا اور جو گمراہی کی راہ چلے گا اس کا انجام خود ہی بھگتے گا۔ کوئی دوسری جان کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔ 'وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ ..... الایۃ' یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو قوموں پر عذاب کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اختیار فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب بھیجنے سے پہلے اتمام حجت کے لیے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب کے لیے تم کیا جلدی مچائے ہوئے ہو، اس کا ایک مرحلہ تو طے ہو چکا کہ اتمام حجت کے لیے خدا کا رسول تمھارے پاس آ گیا۔ اب تو عذاب کے آنے میں صرف اتنی کسر باقی ہے کہ تم پر حجت تمام ہو جائے۔ تمھاری شامت ہی ہوگی اگر تم نے اس فرصت سے فائدہ نہ اٹھایا۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا (۱۶)

'امر' کا مفہوم

'اَمَرَ' صرف حکم دینے ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ بسا اوقات کسی کو ڈھیلا چھوڑ دینے اور مہلت دے دینے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ آپ کسی شخص یا گروہ سے افہام و تفہیم کی کوشش کرنے کے بعد جب تنگ آ جاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ 'اِفْعَلُوْا مَا شِئْتُمْ' جاؤ، جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ بظاہر یہ امر ہی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم امہال ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی سرکش لوگوں پر اپنی حجت تمام کر چکنے کے بعد ان کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح سے بھر لیں۔

'مُتْرَفِيْنَ' کسی قوم کے کھاتے پیتے خوش حال طبقہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ قوم کی باگ انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس وجہ سے سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اصلاح میں سب سے پہلے اسی طبقہ کو خطاب کیا ہے۔ پھر جب اس طبقہ نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے نہ صرف ان کو مایوس کر دیا ہے بلکہ ان کے قتل کے درپے ہو گیا ہے تو نبی نے ہجرت فرمائی اور قوم عذابِ الٰہی کی گرفت میں آ گئی ہے۔

یہ عذاب کے معاملے میں سنتِ الٰہی کی مزید وضاحت ہے۔ فرمایا کہ جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حالوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ اس میں خوب کھل کر خدا کی نافرمانیاں اور بدمستیاں کرتے تا آنکہ ان پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور ان کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ پھر خدا ان کو پکڑتا ہے اور اس بستی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا (۱۷)

یہ اسی مذکورہ سنتِ الٰہی کی تائید میں پچھلی تاریخ کا حوالہ ہے کہ نوحؑ کے بعد ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کیا ہے۔ اگر یہ لوگ دیدۂ عبرت رکھتے ہیں تو ان کے حالات سے سبق لیں۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ وہ تمہاری قوم کے سرکشوں کے جرائم سے بھی اچھی طرح باخبر ہے اور سارے حالات کو دیکھ رہا ہے۔ جب وقت آ جائے گا تو وہ ان کا فیصلہ کرنے میں بھی دیر نہیں لگائے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاۗءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۱۸)

'عاجلۃ' کا مفہوم

'عَاجِلَة' آخرت کا متقابل لفظ ہے یعنی یہ دنیا اور اس کا نفع عاجل۔

امہال کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ امہال کے باب میں سنتِ الٰہی بیان ہو رہی ہے کہ جو لوگ آخرت کو یک قلم نظر انداز کر کے صرف اسی دنیا اور اس کے نفع عاجل کے طلب گار بنتے ہیں خدا ان کو بھی محروم نہیں کرتا بلکہ ان میں سے بھی جس کے لیے چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ البتہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ ایسے لوگوں کا حصہ آخرت میں صرف جہنم ہے جس میں وہ مذموم و مطرود ہو کر داخل ہوں گے۔

اس آیت میں 'مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ' کے الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بات بھی دنیا طلبوں کے اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ جو شخص اس دنیا میں جتنا چاہے حاصل کر لے بلکہ یہ معاملہ کلیۃً خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱۹)

اصل فائز المرام گروہ

یہ آخرت کے طلبگاروں اور اصل فائز المرام گروہ کا بیان ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ آخرت کے طالب بنتے ہیں اور اس کے شایان شان کوشش بھی کرتے ہیں اور ان کے سینے ایمان سے بھی منور ہیں، درحقیقت یہی لوگ ہیں جن کی سعی عند اللہ مقبول ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ اس دنیا میں سے بھی جو کچھ ان کے لیے مقدر ہے پاتے ہیں اور آخرت، تو ان کی کامیابی کا گھر ہے ہی۔

اس آیت میں بھی 'وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ' کے الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت صرف تمنا کرنے سے نہیں مل جائے گی، بلکہ اس کے لیے اس کے شایانِ شان کوشش بھی مطلوب ہے اور ساتھ ہی شرک کی ہر آمیزش سے پاک ایمان بھی۔ جب تک یہ دونوں چیزیں طلبِ آخرت کے ساتھ نہیں ہوں گی اس وقت تک یہ تمنا لاحاصل ہی رہے گی۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۲۰)

رب کی عطاء بخشش عام ہے

لفظ 'کل' جب مختلف جماعتوں کے ذکر کے بعد اس طرح آئے جس طرح یہاں آیا ہے تو وہ معرفہ کے حکم میں ہو جاتا ہے۔ یعنی اس سے وہ جماعتیں مراد ہوتی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے رب کی عطا و بخشش کا دروازہ مذکورہ دونوں گروہوں میں سے کسی پر بھی بند نہیں۔ جو لوگ آخرت سے بالکل بے پروا رات دن دنیا ہی کی طلب میں سرگرم ہیں، ان کو بھی خدا اس دنیا میں سے جو کچھ ان کے لیے مقدر کر رکھا ہے، دیتا ہے، یہ نہیں کرتا کہ ان کی خدا فراموشی اور آخرت فراموشی کے جرم میں ان کو دنیا سے محروم کر دے۔ اسی طرح جو لوگ آخرت کے طالب بنتے ہیں خدا اس دنیا میں سے ان کا مقدر حصہ دیتا ہے۔ یہ نہیں کرتا کہ دنیا سے بے پروائی کے سبب سے ان کو دنیا سے محروم کر دے بلکہ ان کو اس دنیا میں سے بھی ان کا حصہ دیتا ہے اور آخرت میں بھی وہ اپنی کوششوں کا بھرپور صلہ پائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اصل حقیقت یہ ہے تو آدمی اس فانی اور حقیر دنیا کے پیچھے اپنے آپ کو آخرت کی ابدی اور لازوال نعمتوں سے کیوں محروم کرے۔ وہ راستہ کیوں نہ اختیار کرے جس پر چل کر آخرت کی ابدی نعمتوں کا بھی حقدار بنے اور اس دنیا میں سے بھی جو کچھ اس کے لیے مقدر ہے اس سے بہرہ مند ہو۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا (۲۱)

یعنی دیکھو یہ حقیقت اپنی جگہ پر بالکل واضح ہے کہ خدا ہی نے جس کو چاہا ہے زیادہ دیا ہے اور جس کو چاہا ہے کم دیا ہے۔ یہ انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جتنا چاہے حاصل کر لے۔ اسی طرح آخرت میں بھی تمام اختیار خدا ہی کے ہاتھ میں ہوگا، وہی جس کو چاہے گا عزت دے گا اور جس کو چاہے گا ذلت دے گا کسی

دوسرے کو وہاں یہ زور و اثر حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ یہ آخرت اپنے درجات و مراتب کے لحاظ سے اس دنیا کے درجات و مراتب کے لحاظ سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگی تو جس کو کوشش کرنی ہو وہ اس کے درجات و مراتب کا طالب بنے اور اس کے لیے کوشش کرے، اس دنیا کے پیچھے آخرت کو کیوں برباد کرے۔

۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۲۲-۳۹

اوپر آپ نے دیکھا کہ آیت ۹ میں یہ فرما کر اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ ...... الاٰیة (یہ قرآن اس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سیدھا ہے) کلام کا رخ بعض دوسری متعلق باتوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب پھر کلام اپنے اصل سلسلہ سے مربوط ہو گیا اور قرآن خدا تک پہنچنے کے جس راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کی وضاحت شروع ہو گئی۔ یہی راستہ فطرت اور عقل کا سیدھا راستہ ہے اور یہی اس عدل و احسان کی زندگی کو وجود میں لاتا ہے جو خدا کو پسند ہے اور جس پر صالح معاشرہ اور صالح تمدن کی بنیاد ہے۔ یہاں سورۂ نحل کی آیت ۹۰ ذہن میں پھر تازہ کر لیجیے جس میں قرآن کے اوامر اور منہیات کی اساسات واضح کی گئی ہیں۔ اس لیے کہ آگے کی آیات اسی اجمال کی شرح کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ...... الاٰیة ——— آگے آیات کی تلاوت کیجیے۔

ع ۲ | آیات ۲۲-۳۹

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ

رَبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾ وَلَا تَقْتُلُوْٓا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى إِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۖ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهٗ ۖ وَأَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ﴿۳۴﴾ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۚ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلًا ﴿۳۵﴾ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ أَوْحٰٓى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

ع ۳ ۹ ۳

ترجمہ آیات ۲۲-۳۹

اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کرکہ تو سزاوار مذمت اور دھتکارا ہو کر رہ جائے

اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرو۔ اگر وہ تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں، ان میں سے ایک یا دونوں، تو نہ ان کو اف کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے شریفانہ بات کہو اور ان کے لیے رحمدلانہ اطاعت کے بازو جھکائے رکھو اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب ان پر رحم فرما، جیسا کہ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا۔ تمھارا رب جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اس سے خوب واقف ہے۔ اگر تم سعادت مند رہو گے تو وہ رجوع کرنے والوں کو بڑا بخشنے والا ہے۔ ۲۳-۲۵

اور تم قرابت دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو بھی اور مال کو اللے تللے نہ اڑاؤ۔ اللے تللے اڑا دینے والے شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اور اگر تمھیں اپنے رب کے فضل کے انتظار میں، جس کے تم متوقع ہو، ان سے اعراض کرنا پڑ جائے تو تم ان سے نرمی کی بات کہہ دو۔ اور نہ تو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے رکھو اور نہ اس کو بالکل کھلا ہی چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ رہو۔ بے شک تمھارا رب ہی ہے جو رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، بے شک وہی اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ ۲۶-۳۰

اور تم اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشہ سے قتل نہ کرو، ہم ہی ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ بے شک ان کا قتل بہت بڑا جرم ہے۔ اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ کیونکہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت بری راہ ہے۔ اور جس جان کو خدا نے محترم ٹھہرایا اس کو قتل مت کرو مگر حق پر اور جو ظلماً قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا تو وہ قتل میں حدود سے تجاوز نہ کرے کیونکہ اس کی مدد کی گئی ہے۔ اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو مگر اس طریقہ سے جو اس کے حق میں

بہتر ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے سن پختگی کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو کیونکہ عہد کی پرسش ہوتی ہے۔ اور جب تم ناپو تو ناپ پوری رکھو اور وزن صحیح ترازو سے کرو۔ یہی بہتر اور مآل کار کے اعتبار سے خوب تر ہے اور جس چیز کا تمھیں علم نہیں اس کے درپے نہ ہوا کرو۔ کیونکہ کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک چیز کی پرسش ہونی ہے اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ[1] پہاڑوں کے طول کو پہنچ سکتے ہو۔ ان ساری باتوں کی برائی تمھارے رب کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ ہے۔ ۳۴-۳۸

یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمھارے رب نے حکمت میں سے تمھاری طرف وحی کی ہیں اور خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ کرو کہ تم ملامت زدہ اور راندہ ہو کر جہنم میں جھونک دیے جاؤ[1]۔ ۳۹

تورات کے احکام عشرہ

[1] تورات میں کم و بیش یہی باتیں جس انداز میں کہی گئی ہیں ان سے واقف رہنا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگا اس وجہ سے ہم اس کا ضروری حصہ یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا، بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہہ کہ تم پاک رہو کیونکہ میں جو خداوند تمھارا خدا ہوں پاک ہوں۔ تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے اور تم میرے سبتوں کو ماننا۔ میں خداوند تمھارا خدا ہوں۔ تم بتوں کی طرف رجوع نہ ہونا اور نہ اپنے لیے ڈھالے ہوئے دیوتا بنانا۔ میں خداوند تمھارا خدا ہوں اور جب تم خداوند کے حضور سلامتی کے ذبیحے گزرانو تو ان کو اس طرح گزراننا کہ تم مقبول ہو۔ ....

اور جب تم اپنی زمین کی پیداوار کی فصل کاٹو تو اپنے کھیت کے کونے کونے تک پورا پورا نہ کاٹنا اور نہ کٹائی کی گری پڑی بالوں کو چن لینا۔ اور تو اپنے انگورستان کا دانہ دانہ نہ توڑ لینا اور نہ اپنے انگورستان کے گرے ہوئے دانوں کو جمع کرنا، ان کو غریبوں اور مسافروں کے لیے چھوڑ دینا۔ میں خداوند تمھارا خدا ہوں۔ تم چوری نہ کرنا اور نہ دغا دینا اور نہ ایک دوسرے سے جھوٹ بولنا اور تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھانا جس سے تو اپنے خدا کے نام کو ناپاک ٹھہرائے۔ میں خداوند ہوں۔ تو اپنے پڑوسی پر ظلم نہ کرنا نہ اسے لوٹنا۔ مزدور کی مزدوری تیرے پاس ساری رات صبح تک رہنے نہ پائے۔ تو بہرے کو نہ کوسنا اور نہ اندھے کے آگے ٹھوکر کھانے کی چیز کو دھرنا بلکہ اپنے خدا سے ڈرنا۔ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۔ (۲۲)

واحد کا خطاب جمع کے لیے

ہم متعدد مقامات میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ واحد کا خطاب بسا اوقات جمع کے لیے بھی آتا ہے۔ اس صورت میں گویا جماعت کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ چنانچہ بیچ بیچ میں خطاب کے لیے جمع کا صیغہ بھی استعمال ہو گیا ہے جس سے خطاب کی اصل نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس بیچ میں اگر کہیں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوا ہے تو وہ جماعت کے امام کی حیثیت سے ہوا ہے اس کی حیثیت شخصی خطاب کی نہیں ہے۔

'فَتَقْعُدَ' کا مفہوم

'فَتَقْعُدَ' یہاں اس مفہوم میں آیا ہے جس مفہوم میں افعالِ ناقصہ مثلاً 'فَتَكُوْنَ'، 'فَتُصْبِحَ' وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ اردو میں بھی 'بیٹھ رہو'، 'بیٹھ رہے ہے'، اس مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس صورت میں بیٹھنے کے معروف مفہوم سے یہ لفظ مجرد ہو جاتا ہے۔

قرآن کے طریق اقوم کی بنیادی دفعہ

قرآن جس عدل یا طریق اقوم کی تعلیم دیتا ہے یہ اس کی بنیادی دفعہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ خالق، مالک، رازق صرف خدا ہے تو اس کے حقوق اور اس کی خدائی میں کسی اور کو ساجھی بنانا عدل کے منافی اور بہت بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے۔

خدا کا شریک بنانے کا انجام

'فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا' یہ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنانے کا انجام بیان ہوا ہے اور 'تَقْعُدَ' کا ظرف 'یَوْمَ الْقِیٰمَةِ' یہاں محذوف ہے۔ یعنی اگر خدا کے ساتھ اس کے حقوق میں کسی اور کو شریک بناؤ گے تو قیامت کے روز سزاوار مذمت اور مخذول ہو کر رہ جاؤ گے۔ تم خود اپنی بدبختی کے ذمہ دار ہو گے اور تمہارے مزعومہ شرکاء و شفعاء میں سے نہ صرف یہ کہ کوئی تمہارا ساتھ نہ دے گا بلکہ وہ بھی تم پر لعنت اور نفرت کریں گے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۲۳)

خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا

یعنی یہ خدا ہی کا کام ہے کہ وہ یہ بتائے کہ اس کے حقوق میں کوئی شریک ہے یا نہیں ہے سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے سوا تم کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ خدا کے بعد سب سے بڑا حق ہو سکتا ہے تو والدین کا اپنی اولاد پر

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) خداوند ہوں۔ تم فیصلہ میں ناراستی نہ کرنا۔ نہ تو تو غریب کی رعایت کرنا نہ بڑے آدمی کا لحاظ بلکہ راستی کے ساتھ اپنے ہم سایہ کا انصاف کرنا۔ تو اپنی قوم میں ادھر ادھر لترا پن نہ کرتے پھرنا اور نہ اپنے ہم سایہ کا خون کرنے پر آمادہ ہونا، میں خداوند ہوں۔ تو اپنے بھائی سے بغض نہ رکھنا .... تو انتقام نہ لینا اور نہ اپنی قوم کی نسل سے کینہ رکھنا بلکہ اپنے ہم سایہ سے اپنی مانند محبت کرنا۔ میں خداوند ہوں۔ تم میری شریعتوں کو ماننا۔"

احبار باب ۱۹

ہو سکتا ہے اس لیے کہ ان کی پیدائش اور پرورش و پرداخت کا وہ ذریعہ بنتے ہیں لیکن ان کا حق بھی اللہ نے یہ نہیں قرار دیا کہ وہ اس کی عبادت میں شریک ٹھہرائے جائیں بلکہ ان کا حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ احسان کیا جائے۔ 'اِحْسَانًا' یہاں فعل محذوف سے مفعول مطلق ہے اس وجہ سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان کے ساتھ نہایت بہتر سلوک کیا جائے۔ یہاں سیاق کلام سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اگر عبادت میں کسی اور کو شریک کرنے کی کوئی ادنیٰ گنجائش بھی ہوتی تو اس کے حق دار والدین ہو سکتے تھے لیکن جب خدا نے ان کو بھی شریک نہیں کیا، ان کو صرف احسان ہی کا حقدار ٹھہرایا تو تا بدیگراں چہ رسد!

'اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا'

'اُف' دل کی بیزاری کے اظہار کا کلمہ ہے اور 'نَهْر' کے معنی ڈانٹنے اور جھڑکنے کے ہیں۔ اوپر جس احسان کا حکم ہے یہ اس کی وضاحت ہے کہ اگر ماں باپ تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو نہ ان کے خلاف دل میں کوئی بیزاری پیدا ہونے پائے اور نہ زبان سے ان کے سامنے کوئی کلمہ سوءِ ادب کا نکلے بلکہ جب بھی ان سے بات کرنے کا موقع آئے شریفانہ اور سعادت مندانہ بات کرو اور ان کی دلداری و تسلی کرتے رہو۔

والدین کا حقِ احسان

آیت میں بڑھاپے تک پہنچ جانے کا حوالہ محض اس لیے دیا گیا ہے کہ یہی زمانہ ہوتا ہے جس میں ان لوگوں کو ماں باپ بوجھ محسوس ہوتے ہیں جو ان کی ان قربانیوں اور جاں فشانیوں کو بھول جاتے ہیں جو انھوں نے ان کے لیے بچپن میں کی ہوتی ہیں۔ سعادت مند اولاد تو اس بات کو یاد رکھتی ہے کہ جس طرح کبھی ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں مجھ کو اپنے والدین کی گود میں ڈالا گیا تھا اسی طرح اب میرے والدین ہڈیوں کے ایک ڈھانچے کی صورت میں میرے حوالے کیے گئے ہیں اور میرا فرض ہے کہ میں ان کے احسان کا بدلہ احسان کی صورت میں دوں لیکن ہر شخص اس بات کو یاد نہیں رکھتا۔ یہ اسی بات کی یاد دہانی ہے۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ والدین ہر دور میں محبت، تعظیم اور احسان کے حق دار ہیں ـــــ یہاں یہ بات ذہن میں محفوظ رہے کہ اوپر والی آیت میں جس طرح سب سے بڑے عدل کا ذکر آیا ہے اسی طرح اس آیت میں سب سے بڑے احسان کا ذکر ہے جو قرآن کی تعلیمات میں دوسری اساسی تعلیم کا درجہ رکھتا ہے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (۲۴)

والدین کا حقِ فرمانبرداری و خدمت

'ذُل' کے معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ اس کے لیے 'جَنَاح' کے استعارے میں یہ تلمیح مضمر ہے کہ تمہارے والدین نے تمہارے بچپن میں تمھیں اس طرح اپنے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھا جس طرح پرندہ اپنے بچے کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتا ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ ان کے بڑھاپے میں تم بھی انھیں اپنی اطاعت و محبت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھو۔ اس اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ 'مِنَ الرَّحْمَةِ' کی قید اس کے منبع اور محرک کا پتہ دیتی ہے کہ یہ اطاعت و فرماں برداری تمام تر مہر و محبت اور شفقت و رحمت پر مبنی ہو، اس میں کسی

اور جذبہ کو دخل نہ ہو اس لیے کہ ان کی شفقت و محبت کا حق اگر کچھ ادا ہو سکتا ہے تو مہر و محبت کے جذبہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ بغیر اس جذبے کے کوئی شخص والدین کا حق ان کے بڑھاپے میں ادا نہیں کر سکتا۔

والدین کے لیے دعا کا حق

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا ...... الآیۃ۔ خدمت و محبت کے ساتھ ساتھ ان کے لیے یہ دعا کرتے رہنے کی ہدایت ہوئی کہ اے میرے رب جس طرح شفقت و محبت کے ساتھ انھوں نے بچپن میں مجھے پالا اسی طرح اس بڑھاپے میں تو ان پر اپنی محبت و رحمت نازل فرما۔ یہ دعا والدین کا حق بھی ہے۔ اس میں اس حق کی یاد دہانی بھی ہے جو والدین سے متعلق اولاد پر عائد ہوتا ہے اور یہ اس جذبۂ محبت کی محرک بھی ہے جو والدین کے ساتھ سلوک کے معاملے میں مطلوب ہے۔

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِن تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا (۲۵)

والدین کے لیے دلی محبت اور کامل سعادت مندی

بڑھاپے میں والدین کی خدمت و محبت اس طرح کرنا جس طرح قرآن نے ہدایت فرمائی ہے کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ اس میں صرف ظاہری اطاعت ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ پاکیزہ قلبی جذبۂ محبت اور دلی لگاؤ بھی مطلوب ہے۔ اس کی اس مشکل کی وجہ سے قرآن نے یہ وضاحت بھی فرما دی کہ اصل مطلوب دلی محبت اور کامل سعادت مندی ہے۔ اگر یہ چیز موجود ہے تو خدا دلوں کے حال سے خوب واقف ہے۔ اس کے ہوتے اگر کوئی چھوٹی موٹی اتفاقیہ کوتاہی صادر ہو گئی تو اس کی تلافی توبہ اور رجوع الی اللہ سے ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اپنی اس طرح کی کوتاہیوں پر برابر اللہ سے معافی مانگتے رہیں گے تو اللہ ان کو معاف کر دے گا۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا (۲۶-۲۷)

قرابت دار، مسکین اور مسافر کا حق

عدل اور احسان کے حکم کے بعد قرآنی اوامر کی تیسری اساسی چیز ایتائے ذی القربی یعنی عزیزوں اور قرابت داروں کی خدمت ہے۔ اب یہ اس کا بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ قرابت دار، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحبِ مال کے مال میں اس کے قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کا بھی حق ہے۔ یہاں لفظ 'حق' کا استعمال اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ محض اخلاقی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری حق واجب کی ہے جس کی ادائیگی صاحبِ مال پر لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص اس حق کو ادا نہ کرے گا تو وہ عند اللہ غصبِ حقوق کا مجرم ٹھہرے گا۔ قرابت دار کے بعد دوسرا درجہ مسکین کا ہے۔ قرابت دار تو مجرد قرابت کی بنا پر حق دار بن جاتا ہے لیکن مسکین کو اس کی مسکینی حقدار بناتی ہے۔ اگر کوئی قرابت دار مسکین بھی ہو تو اس کا حق دہرا ہو جائے گا۔ قرابت دار کے بعد معاً مسکین کا ذکر اسلامی معاشرے میں مسکین کے درجے اور مرتبے کو ظاہر کرتا ہے۔ مسکین کے بعد ابن السبیل یعنی مسافر کا حق ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ مسافر صرف مسافر ہونے کی بنا پر حقدار بنتا ہے، اس کا مسکین ہونا ضروری نہیں ہے، ورنہ اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ حالتِ سفر بجائے خود ایسی چیز ہے جو عام حالات میں آدمی کو دوسروں کی مدد

کا محتاج بنا دیتی ہے اگرچہ وہ فقہی مفہوم میں مسکین کے حکم میں نہ آتا ہو۔

اعتدال و کفایت شعاری کی ہدایت

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ظاہر ہے کہ جب ہر صاحب مال کے مال میں دوسروں کے بھی حقوق ہوئے تو اس کو الّلے تلّلے خرچ کرنے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ پھر تو اس کے لیے صحیح رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ احتیاط اعتدال اور کفایت شعاری کے ساتھ اپنی جائز ضروریات پر خرچ کرے اور بقیہ مال کے معاملے میں وہ اپنے آپ کو دوسرے حق داروں کا امین سمجھے، اور اس امانت کو نہایت احتیاط کے ساتھ ادا کرے۔ جو شخص اپنی ضروریات کے معاملے میں محتاط اور کفایت شعار نہیں ہو گا اس کو اپنے ہی شوق پورے کرنے سے فرصت نہیں ہو گی تو وہ دوسروں کے حقوق کہاں سے ادا کر پائے گا۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ...... الآیۃ فرمایا کہ جو لوگ فضول خرچ ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ جن لوگوں کو اللہ اپنی نعمت دیتا ہے اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی نعمت کے شکرگزار ہوں اور اس کو انہی کاموں پر صرف کریں جو اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے موجب ہوں لیکن شیطان ان کو ورغلا کر اپنی راہ پر لگا لیتا ہے اور خدا کا بخشا ہوا مال ان سے ان کاموں پر خرچ کراتا ہے جو ان کو خدا سے دور سے دور تر اور شیطان سے قریب سے قریب تر کر دیں۔

وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا (۲۸)

یہ اس حالت کے لیے ہدایت ہے جب کہ بروقت کوئی شخص اس پوزیشن میں نہ ہو کہ وہ اوپر بیان کیے ہوئے حقوق ادا کر سکے۔ فرمایا کہ اگر تمہارے حالات ایسے ہوں کہ مذکورہ حق داروں میں سے کسی کی امداد سے تمھیں مجبوراً اعراض ہی کرنا پڑ جائے اور تمھیں توقع ہو کہ مستقبل قریب میں تمہارے حالات درست ہو جائیں گے اور تم اس کی مدد کر سکو گے تو اس سے دلداری اور ہمدردی کی بات کرو اور آئندہ کے لیے اچھے وعدے کے ساتھ اس کو رخصت کرو۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا (۲۹)

ہاتھ کو گردن سے باندھ لینا، تعبیر ہے انتہائی بخل اور خست کی اور ہاتھ کو بالکل کھلا چھوڑ دینا تعبیر ہے اسراف و تبذیر کی۔

اوپر آیات ۲۶-۲۷ میں اسراف و تبذیر کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس کے باب میں غلط فہمی سے بچانے کے لیے یہ صحیح نقطۂ اعتدال کی وضاحت فرما دی کہ منشائے الٰہی یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی ضروریات کے معاملے میں بالکل ہی بخیل و خسیس بن کر رہ جائے بلکہ صرف یہ مطلوب ہے کہ وہ اعتدال و کفایت شعاری کا رویہ اختیار کرے نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ ہی لے، نہ ان کو بالکل کھلا ہی چھوڑ دے، بلکہ اعتدال کے ساتھ اپنی جائز ضروریات پر بھی خرچ کرے اور دوسروں کے حقوق بھی ادا کرے۔ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا یہاں تَقْعُدَ اسی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں آیت ۲۲ میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے ہاتھ بالکل ہی کھلے ہوئے چھوڑ دو گے تو بالآخر

اس کا نتیجہ یہ سامنے آئے گا کہ دوسروں کے حقوق کے معاملے میں سزاوار ملامت بھی ٹھہرو گے اور ادائے حقوق سے قاصر و درماندہ بھی ہو کر رہ جاؤ گے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا (۳۰)

یہاں 'یقدر' کے بعد بھی 'لمن یشآء' ہے جو وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔

رزق کی تنگی و کشادگی خدا کی مشیت پر منحصر ہے

اوپر والی آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ 'اور نہ تم اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھ کے رکھو'، یہ آیت اسی کی وضاحت میں ہے کہ رزق کی تنگی و کشادگی کا انحصار آدمی کی اپنی تدبیروں پر نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر خدا کی حکمت و مشیت پر منحصر ہے، وہ اپنے بندوں کے حال سے اچھی طرح باخبر اور ان کا نگران و نگہبان ہے۔ وہی اپنی مشیت و حکمت کے تحت جس کے لیے رزق کو چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کے رزق کو چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

بندے کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ وہ احتیاط و اعتدال کے ساتھ اپنی ضروریات پر بھی خرچ کرے اور دوسروں کے حقوق بھی ادا کرے۔ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جو اس نقطۂ اعتدال سے منحرف ہو، خواہ وہ کسی سمت میں ہو۔

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ ۚ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا (۳۱)

'املاق' کے معنی مفلسی اور ناداری کے ہیں۔

قتلِ اولاد کی ممانعت

یہ بات اوپر والی بات ہی پر متفرع ہے۔ یعنی جب اصل حقیقت یہ ہے کہ اصل رازق خدا ہی ہے تو کسی دوسرے کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسری جان کو اس اندیشہ سے ہلاک کر دے کہ وہ کھائے گی کیا۔ عرب جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی جو سنگ دلانہ رسم جاری تھی اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ عورت کوئی کمائو فرد تو ہے نہیں تو لڑکیوں کی پرورش کا بوجھ کیوں اٹھایا جائے۔ قرآن نے اس سنگ دلانہ جرم کے اصل محرک پر ضرب لگائی اور اس بربریت کا خاتمہ کیا۔ موجودہ زمانے میں ضبط ولادت کے نام سے جو تحریک چل رہی ہے اور جس کو بروئے کار لانے کے لیے روز نت نئی ترکیبیں ایجاد ہو رہی ہیں، وہ بظاہر تو وحشیانہ نہیں ہیں لیکن فلسفہ اور عقیدہ بنیادی طور پر اس کے اندر بھی وہی کارفرما ہے جو عرب جاہلیت کی بربریت کا محرک تھا۔ جاہل عربوں کی طرح موجودہ زمانے کا متمدن انسان بھی اپنے آپ کو دوسروں کا رزاق سمجھ بیٹھا ہے۔ قرآن نے 'نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ' فرما کر اس گمراہی کی اصلاح کی ہے۔ عرب کے وحشی تو اس حقیقت کو سمجھ گئے اور انھوں نے اپنی اصلاح بھی کر لی لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے جاہلوں کو کون سمجھائے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ ۖ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا (۳۲)

منہیات کا بیان

آیت ۳۱ پر قرآنی اوامر ـــ عدل، احسان، ایتائے ذی القربیٰ ـــ سے متعلق بنیادی مسائل ختم ہوئے۔ اب آگے قرآنی منہیات ـــ فحشاء، منکر، بغی ـــ کے تحت جو چیزیں آتی ہیں ان کا بیان شروع ہو رہا ہے۔

زنا اور اس کے محرکات کی ممانعت

منہیات کے باب میں سب سے پہلے زنا کو لیا ہے اس لیے کہ یہ برائی صالح معاشرہ کی جڑ پر کلہاڑا مارنے والی برائی ہے۔ صالح معاشرہ کی بنیاد صالح خاندان پر ہے۔ صالح خاندان صحیح فطری جذبات کے ساتھ صرف

اسی صورت میں وجود پذیر ہو سکتا ہے جب والدین کے ساتھ اولاد کا تعلق صحیح خون، صحیح نسب اور پاکیزہ رحمی رشتہ پر استوار ہو۔ اگر یہ چیز مفقود ہو جائے تو خاندان خاندان نہیں بلکہ فطری و روحانی جذبات و عواطف سے بالکل محروم و ناآشنا حیوانات کا ایک گلہ ہے۔ حیوانات کا کوئی گلہ نہ کسی صالح معاشرہ کی بنیاد رکھ سکتا نہ کسی صالح تمدن کا مقدمۃ الجیش بن سکتا۔

قرآن نے زنا کے اس مفسدے کے باعث اس کو اپنی منہیات کے باب میں سب سے پہلے لیا ہے اور ایسے لفظوں میں اس سے روکا ہے جو زنا اور زنا کے تمام دواعی و محرکات کا سدباب کرنے والے ہیں۔ فرمایا لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی جس کے معنی ہیں زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ 'زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو' یعنی ان تمام باتوں سے بھی دور دور رہو جو زنا کی محرک، اس پر اکسانے والی اور اس کے قریب لے جانے والی ہیں۔ یہاں بات صرف اصولی حیثیت سے فرمائی گئی ہے۔ اس وجہ سے اس کی کوئی تفصیل نہیں آئی ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ نور میں آئے گی جو اس گروپ کی آخری سورہ ہے۔ اس کی تفسیر میں انشاء اللہ ہم واضح کریں گے کہ قرآن نے کن کن باتوں سے محض اس بنیاد پر روکا ہے کہ وہ زنا کے مقدمات و محرکات میں سے ہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا یہ زنا کی ممانعت کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی بری راہ ہے۔ 'کھلی ہوئی بے حیائی' یعنی اس کے برائی اور بے حیائی ہونے پر کسی منطقی بحث و حجت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ فطرت انسانی کی قدیم ترین جانی پہچانی ہوئی حقیقتوں میں سے ایک واضح ترین حقیقت ہے۔ انسان جب سے دنیا میں موجود ہے اس نے مرد و عورت کے آزادانہ تعلق کو کبھی گوارا نہیں کیا بلکہ اس پر ہمیشہ نہایت سخت پابندیاں رہی ہیں اور وہ لوگ کبھی خوش دلی کے ساتھ معاشرے میں گوارا نہیں کیے گئے ہیں جنھوں نے ان پابندیوں کو توڑا ہے۔ 'وَسَاۗءَ سَبِيْلًا' یعنی اس طریق اقوم سے یہ بالکل منحرف راہ ہے جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ جو لوگ اس راستہ پر چل پڑتے ہیں وہ صالح خاندان، صالح معاشرہ اور بالآخر صالح حکومت سب کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دیتے ہیں۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (۳۳)

قتل کی ممانعت اور اسلامی قانون کا مزاج

النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ یعنی ہر وہ جان جس کو اللہ نے محفوظ و معصوم قرار دیا ہے، جو مباح الدم نہیں ہے، کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو قتل کرے مگر حق کی بنا پر۔ یعنی صرف اس صورت میں جس میں شریعت نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس قانونی جواز کے بغیر قتل ہوا تو وہ مظلومانہ قتل ہوا۔ ایسی صورت میں فرمایا کہ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا 'ہم نے اس کے اولیاء کو قاتل کے اوپر پورا اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس سے قصاص لیں، چاہیں تو خون بہا لیں اور اگر چاہیں تو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ پورا اختیار دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی حکومت اولیائے مقتول کی مرضی لازماً نافذ کرائے گی۔ فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ

إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا یہ اولیائے مقتول کے لیے ہدایت ہے کہ چونکہ ان کو قانون اور حکومت کی حمایت حاصل ہے اس وجہ سے ان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ قاتل کو قتل کرنے کے معاملے میں حدود سے تجاوز کریں مثلاً یہ کہ اصل قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کر دیں یا قتل کے ایسے طریقے اختیار کریں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے، مثلاً آگ میں جلانا یا مثلہ کرنا۔

اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اسلامی قانون میں قتل کے معاملے میں اصل مدعی کی حیثیت حکومت کی نہیں بلکہ اولیائے مقتول کی ہے، حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اولیائے مقتول کی مرضی ٹھیک ٹھیک نافذ کرا دے۔ حکومت مدعی صرف اس شکل میں ہو گی جب مقتول لاوارث ہو یا وارث ہوں تو سہی لیکن کسی سبب سے ان کو مقتول کے معاملے سے کوئی دلچسپی نہ رہ گئی ہو۔ موجودہ قوانین میں سارا اختیار صرف حکومت ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ اولیاء کو سرے سے کوئی تعلق رہ ہی نہیں جاتا۔ ہمارے نزدیک موجودہ قوانین اسلامی قانون کی بہت سی برکتوں سے خالی ہیں۔ ہم نے اس مسئلے پر اپنی ایک دوسری کتاب میں بحث کی ہے، یہاں اس کے اعادے کی گنجائش نہیں ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ﴿٣٤﴾

مال یتیم کی حفاظت

اور جس شدت کے ساتھ زنا اور اس کے دواعی و محرکات سے روکا ہے اسی شدت کے ساتھ یہ یتیم کے مال میں کسی ناجائز تصرف سے روکا ہے۔ فرمایا کہ بجز بہتری و بہبود کے ارادے کے یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ یعنی یتیم کے مال میں اولیاء کی صرف وہی مداخلت جائز ہے جو اس کی ترقی، اس کی حفاظت اور اس کے نشوونما کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہو۔ ان سے الگ ہو کر جو تصرف بھی ہو گا وہ خیانت ہے اس لیے کہ یتیم کا مال اولیاء کے ہاتھ میں درحقیقت امانت ہوتا ہے۔ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ یعنی اولیاء کی یہ نگرانی صرف اس وقت تک کے لیے ہے جب تک یتیم اپنی پختگی اور سن رشد کو نہیں پہنچ جاتا۔ جب وہ بلوغ و رشد کو پہنچ جائے وہ اپنے مال کا مالک و مختار ہے۔ اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائے۔

ایفائے عہد کی ہدایت

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا۔ یتیم کے مال میں خیانت کی ممانعت کے ساتھ ہی یہ تمام عہود و مواثیق میں خیانت سے منع فرمایا کہ ہر عہد جو کرو اس کو پورا کرو، اس میں کوئی خیانت نہ کرو۔ اس لیے کہ ہر عہد کی بابت عند اللہ پرسش ہونی ہے۔

اس عہد میں ہر قسم کے عہد شامل ہیں۔ خواہ وہ کسی معاہدے کی صورت میں وجود میں آئے ہوں، یا معاہدے کی شکل میں تو وجود میں نہ آئے ہوں لیکن عادۃً اور عرفاً ان کو عہد ہی سمجھا اور مانا جاتا ہو۔ جس نوعیت کا بھی عہد ہو اگر وہ خلاف شریعت نہیں ہے تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔ سورۂ مائدہ کی تفسیر میں ہم یہ حقیقت بھی واضح کر چکے ہیں کہ شریعت کی حیثیت بھی درحقیقت بندوں اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ کی ہے۔ انہی عہود کے ایفاء پر صالح خاندانی

صالح معاشرہ اور صالح حکومت کا قیام و بقا منحصر ہے۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۳۵)

الفائے کیل و وزن کی تاکید

ایفائے عہد کی تاکید کے بعد یہ ایفائے کیل و وزن کی تاکید ہے کہ آپس کے لین دین میں جب کوئی چیز ناپو یا تولو تو ناپ تول میں کوئی خیانت نہ کرو۔ ناپو صحیح پیمانے سے اور تولو ٹھیک ترازو سے۔ یہی طریقہ بہتر اور انجام کار کے اعتبار سے یہی اچھا ہے۔ یعنی معاشی اور تجارتی نقطۂ نظر سے بھی یہی طریقہ سود مند ہے اور مآل کار کے پہلو سے بھی یہی طریقہ بہتر ہے اس لیے کہ خدا کا پسندیدہ یہی طریقہ ہے۔ جو لوگ ڈنڈی ماری کو شیوہ بنا لیتے ہیں بظاہر اس کے کچھ افراد اپنی دانست میں نفع کماتے ہیں لیکن وہ درحقیقت اس عدل و صداقت کی بنیاد ہی کو ڈھا دیتے ہیں جس پر صالح معاشرہ اور صالح تمدن کا قیام و بقا منحصر ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (۳۶)

'قَفُوْتُهٗ'، 'قَفَوْتُ اَثَرَهٗ' کے معنی ہیں میں اس کے پیچھے لگا یا ہو لیا۔ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ یعنی جس چیز کے بارے میں تمہیں قابل اطمینان علم نہیں ہے اس کے پیچھے نہ ہو لیا کرو اور محض اٹکل اور گمان کی بنا پر کسی کے بارے میں کوئی بات نہ لے اڑو۔

قذف اور تہمت وغیرہ کی ممانعت

یہ قذف اور تہمت وغیرہ کی قسم کی ساری باتوں کی ممانعت ہے۔ قرآن جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد حسن ظن اور اعتماد پر ہے اس وجہ سے کسی کے باب میں کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیے جو محض گمان یا افواہ پر مبنی ہو اور وہ اس کی عزت و شہرت کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ فرمایا کہ جو لوگ اس طرح کی غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتے ہیں انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ کان، آنکھ اور دل ہر ایک سے اس طرح کی باتوں کی بابت ایک روز پرسش ہونی ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (۳۷)

غرور و تکبر کی ممانعت

'مَرَح' کے معنی اکڑ کر اور اترا کر چلنے کے ہیں۔ جو شخص اکڑ کر اور اترا کر چلتا ہے وہ زمین پر پاؤں مارتا ہوا اور گردن کو اٹھا کر چلتا ہے۔ یہ متکبرین اور مغروروں کی چال ہے۔ فرمایا کہ یہ مغروروں اور متکبروں کی چال نہ چلو۔ یاد رکھو کہ تم کتنا ہی زمین پر پاؤں مارتے ہوئے چلو لیکن تم خدا کی زمین کو پھاڑ نہیں سکتے، اسی طرح تم کتنا ہی سینہ تان کر اور گردن اور سر کو اونچا کر کے چلو لیکن تم پہاڑوں کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے۔ مطلب یہ کہ جس خدا کی قدرت کی یہ شانیں دیکھتے ہو کہ اس نے تمہارے پاؤں کے نیچے یہ طویل و عریض زمین بچھا دی جس کے اوپر تمہاری حیثیت ایک بھنگے اور چیونٹی کی بھی نہیں اور جس نے یہ فلک بوس پہاڑ تمہارے آگے کھڑے کر دیے جن کے سامنے تم ایک مکھی کی بھی حیثیت نہیں رکھتے اس کی زمین پر اکڑنے اور اترانے کے کیا معنی؟ اپنی حیثیت پہچانو اور خدا کی عظمت اور اس کے جلال کے آگے ہمیشہ سرنگندہ رہو۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آدمی کی یہ حالت اس کے باطن پر عکس ڈالتی ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس شخص کے دل میں خدا کی عظمت و قدرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جن کے دلوں کے اندر خدا کی عظمت و قدرت کا تصور سمایا ہوا ہوتا ہے ان پر تواضع اور فروتنی کی حالت طاری رہتی ہے۔ وہ اکڑنے اور اترانے کے بجائے سر جھکا کر دبے پاؤں چلتے ہیں۔

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا (۳۸)

یہ اوپر کی تمام منہیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان میں سے ہر کام کی برائی تیرے رب کے نزدیک نہایت مکروہ ہے۔ لفظ 'مکروہ' یہاں فقہی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی یہ ساری باتیں خدا کے نزدیک نہایت مبغوض اور قابلِ نفرت ہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو ان میں سے کسی چیز کے بھی مرتکب ہوں گے وہ بھی خدا کے نزدیک قابلِ نفرت ٹھہریں گے۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۳۹)

یہ باتیں اجزائے حکمت میں سے ہیں

'ذٰلِكَ' کا اشارہ ان تمام باتوں کی طرف ہے جو اوپر سے لے کر یہاں تک بیان ہوئی ہیں۔ یہ ساری باتیں حکمت کے اجزاء میں سے ہیں۔ یعنی یہ وہ ٹھوس، راسخ اور غیر متزلزل حقیقتیں ہیں جو عقل، فطرت اور شریعت میں نہایت مضبوط بنیادیں رکھتی ہیں۔ تمہارے رب نے اپنے پیغمبر کے واسطہ سے یہ تمہاری طرف وحی کی ہیں کہ تم اپنی زندگیاں ان سے سنوارو۔

توحید کے مضمون کی یاد دہانی

وَلَا تَجْعَلْ ...... الایۃ یہ آخر میں توحید کے اس مضمون کی پھر یاد دہانی کر دی جس سے آیت ۲۲ میں اس بحث کا آغاز فرمایا تھا۔ گویا توحید ان ساری تعلیمات کے لیے حصار اور شہر پناہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب تک یہ شہر پناہ قائم ہے اس وقت تک یہ تعلیمات بھی قائم ہیں اور اگر اس شہر پناہ میں کوئی رخنہ پیدا ہو گیا تو یہ ساری حکمت کی باتیں بھی ایک ایک کر کے ناپید ہو جائیں گی۔ توحید سے آغاز اور توحید ہی پر اختتام کی مثالیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں بلکہ تورات میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، اگر بحث کے دوسرے گوشوں میں نکل جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں ان کا حوالہ دیتے۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۴۰-۵۷

کفار کی قرآن سے بیزاری کا اصل سبب

آگے کفارِ قریش کی قرآن سے بیزاری کے اصل سبب پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ لوگ چونکہ اپنے مزعومہ معبودوں کو چھوڑنے اور آخرت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں اس وجہ سے قرآن اور پیغمبر سے چڑتے ہیں۔ اسی ضمن میں بطور جملہ معترضہ مسلمانوں کو یہ ہدایت بھی فرما دی گئی کہ تم دعوت میں حکیمانہ طریقہ اختیار کرو۔ مخالفین کے رویے سے متاثر ہو کر زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکال بیٹھو جو ان بدکے ہوئے لوگوں کے لیے مزید وحشت کا سبب بن جائے۔

آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۴۰-۵۷

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾ الربع

وَقَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ

إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۵۲﴾ وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ (۵ ع ۱۲ ۵)
الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿۵۳﴾
رَّبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ ۖ إِن يَشَأْ يَرْحَمْكُمْ أَوْ إِن يَشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَا
أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ
وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ ۖ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ﴿۵۵﴾
قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ
الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ﴿۵۶﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ
رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ
إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿۵۷﴾

ترجمۂ آیات ۴۰-۵۷

کیا تمہارے رب نے تمہارے لیے تو بیٹے مخصوص کیے اور اپنے لیے فرشتوں میں سے
بیٹیاں بنالیں۔ یہ تو تم بڑی ہی سنگین بات کہتے ہو۔ اور ہم نے اس قرآن میں گوناگون اسلوبوں
سے بات واضح کردی کہ وہ یاددہانی حاصل کریں لیکن یہ چیز ان کی بیزاری ہی میں اضافہ کیے
جارہی ہے۔ کہہ دو کہ اگر کچھ اور الٰہ بھی اس کے شریک ہوتے جیسے یہ دعویٰ کرتے ہیں تو وہ عرش والے پر ضرور چڑھائی
کردیتے۔ وہ پاک اور بہت برتر ہے ان باتوں سے جو یہ کہتے ہیں۔ ساتوں آسمان اور زمین اور
جو ان میں ہیں سب اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ
اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ بے شک وہ بڑا ہی حلم والا اور بخشنے والا
ہے۔ ۴۰-۴۴

اور جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں

رکھتے، ایک مخفی پردہ حائل کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر حجاب، اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیتے ہیں کہ نہ اس کو سمجھیں نہ سنیں اور جب تم قرآن میں تنہا اپنے رب ہی کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت کے ساتھ پیٹھ پھیر لیتے ہیں؟ اور ہم خوب جانتے ہیں کہ جب یہ لوگ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو کس غرض سے کان لگاتے ہیں اور جب کہ یہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں جب کہ یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو بس ایک سحر زدہ شخص کے پیچھے چل پڑے ہو۔ دیکھو، تم پر کیسے کیسے فقرے چست کر رہے ہیں۔ یہ لوگ کھوئے گئے ہیں، کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں۔ ۴۵-۴۸

اور یہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے! کہہ دو کہ تم پتھر یا لوہا بن جاؤ یا کوئی اور شے جو تمہارے خیال میں ان سے بھی سخت ہو۔ پھر وہ کہیں گے کہ ہمیں کون دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔ پھر وہ تمہارے آگے سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا؟ کہہ دو کہ عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب ہی آ پہنچا ہو۔ جس دن وہ تم کو پکارے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کرو گے اور تم یہ گمان کرو گے کہ تم بس تھوڑی ہی مدت رہے۔ ۴۹-۵۲

اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔ بے شک شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے، شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن تو ہے ہی۔ تمہارا رب تم کو خوب جانتا ہے، اگر وہ چاہے گا تم پر رحم فرمائے گا یا اگر چاہے گا تم کو عذاب دے گا اور ہم نے تم کو ان پر مسئول بنا کر مامور نہیں کیا ہے۔ اور تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔ ۵۳-۵۵

کہہ دو کہ ان کو پکار دیکھو جن کو تم نے اس کے سوا معبود گمان کر رکھا ہے، نہ وہ تم سے کسی مصیبت کو دفع ہی کر سکیں گے، نہ اس کو ٹال ہی سکیں گے۔ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ تو خود ہی اپنے رب کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے اور وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تمھارے رب کا عذاب چیز ہی ڈرنے کی ہے۔ ۵۶-۵۷

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا ۚ إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا (۴۰)

'اصفاء' کے معنی خاص اور خالص کر دینے کے ہیں۔

تردید شرک نئے اسلوب سے

اوپر کے مجموعۂ آیات کو شرک کی تردید پر ختم فرمایا تھا، اسی مضمون کو ایک نئے اسلوب سے پھر لیا۔ فرمایا کہ کیا تمھارے رب نے تمھیں تو بیٹوں کے لیے مخصوص کر لیا اور خود اپنے لیے فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا لیں۔ یہ واضح رہے کہ فرشتوں کو مشرکین عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور اس وہم کے ساتھ ان کی پرستش کرتے تھے کہ یہ اپنے باپ سے ان کے لیے سفارش کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی اس دوہری حماقت پر توجہ دلائی ہے کہ اول تو کسی کو خدا کا شریک ٹھہرانا ہی حماقت ہے، پھر ستم بالائے ستم تم نے یہ کیا ہے کہ خدا کے لیے بیٹیاں منتخب کی ہیں جن کو خود اپنے لیے سخت ناپسند کرتے ہو۔

إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا۔ یعنی یہ تو تم بڑی ہی بھونڈی اور نہایت ہی سنگین بات کہتے ہو۔ یہ صرف حماقت ہی نہیں بلکہ حماقت در حماقت ہے کہ اپنے رب کے لیے اس چیز کا انتخاب کرتے ہو جس کو اپنے لیے گوارا کرنے پر آمادہ نہیں۔ گویا خدا کو تم نے خود اپنے سے بھی گرا دیا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا (۴۱)

'تصریف' کے معنی گردش دینے کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد کسی حقیقت کو مختلف اسلوبوں اور گوناگون طریقوں سے پیش کرنا ہے۔ مثلاً توحید ہی کا مضمون قرآن میں اتنے مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے بیان ہوا ہے کہ غبی سے غبی آدمی بھی، اگر ہٹ دھرم نہ ہو تو اس کو ذہن نشین کر سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ ضدی اور جھگڑالو ہوتے ہیں، بات کو ماننا نہیں چاہتے، ان کی بیزاری اور نفرت اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے جتنی کہ بات واضح ہوتی جاتی ہے اس لیے کہ اس کی وضاحت کو وہ اپنی شکست اور رسوائی سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ ہم نے اس قرآن میں

توحید کی حقیقت، اور شرک کی شناعت، گوناگوں پہلوؤں سے واضح کی کہ یہ لوگ یاد دہانی حاصل کریں لیکن جتنی ہی ان کی دوا کی گئی اتنا ہی ان کا مرض بڑھتا گیا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا (۴۲)

مشرکینِ عرب، دنیوی بادشاہوں اور بادشاہتوں پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کو تو صاحبِ تخت و تاج یعنی معبودِ اعظم مانتے تھے اور اس کے تحت بہت سے دوسرے دیوی دیوتاؤں کو بھی مانتے تھے جن کی نسبت، ان کا گمان تھا کہ وہ خدائی میں شریک ہیں اور اپنے پجاریوں کے لیے وہ صاحبِ عرش کے تقرب کا بھی ذریعہ بنتے ہیں اور ان کی خواہشیں اور ضرورتیں بھی اس سے پوری کرا دیتے ہیں۔ یہ ان کے اسی واہمہ کی تردید ہے۔ فرمایا کہ اگر خدا کے ساتھ اس کے کچھ شریک و سہیم بھی ہوتے، جیسا کہ تم گمان کیے بیٹھے ہو، تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور صاحبِ عرش سے منازعت و مخاصمت کی راہ ڈھونڈھ لیتے اور یہ آسمان و زمین کا سارا انتظام درہم برہم ہو کے رہ جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ جس زمین کے بادشاہوں اور بادشاہتوں پر قیاس کر کے تم نے یہ تخیل آراستہ کیا ہے اس میں تو دیکھتے ہو کہ آئے دن حکومتوں کے نقشے بگڑتے بنتے رہتے ہیں۔ اگر اسی طرح خدا کے بھی کچھ شریک و سہیم اور حریف ہوتے تو آخر وہ کیوں چپکے بیٹھے رہتے، وہ کیوں نہ صاحبِ عرش بننے کے لیے زور لگاتے لیکن یہاں تو دیکھتے ہو کہ نہ ایک دن کے لیے سورج اپنے محور سے کھسکا اور نہ زمین اپنے مدار سے منحرف ہوئی۔ اسی حقیقت کو دوسرے مقام میں یوں واضح فرمایا ہے۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ ۲۲ انبیاء (اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا دوسرے معبود بھی ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کے رہ جاتے)۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۴۳)

یعنی اللہ تعالیٰ اس قسم کے اوہام و خرافات سے بالکل منزہ اور نہایت برتر ہے۔ ان قیاسات و تشبیہات کا اس کی اعلیٰ صفات کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (۴۴)

تسبیح کا مفہوم

'تسبیح' کی اصل روح تنزیہہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام نسبتوں اور صفتوں سے بری اور بالاتر قرار دینا جو اس کی اعلیٰ صفات اور شان کے منافی ہیں۔ اس کے ساتھ جب 'بِحَمْدِهٖ' کی قید لگ جاتی ہے جس طرح یہاں 'يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ' ہے تو اس کے اندر تنزیہہ کے ساتھ اثبات کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے یعنی اس کو تمام اعلیٰ صفات سے متصف قرار دینا۔

مطلب یہ ہے کہ ایک خاص دائرہ کے اندر خدا نے تم کو اختیار بخشا ہے۔ اس سے غلط فائدہ اٹھا کر تم جو تہمتیں چاہو خدا پر جوڑو لیکن ساتوں آسمان اور زمین اور ان کے اندر جتنی مخلوقات ہیں سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں لیکن تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔

'اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا'۔ یعنی تمہاری یہ حرکت تو ایسی ہے کہ تم پر آسمان ٹوٹ پڑتا لیکن اللہ بڑا

ہی حلیم اور غفور ہے، تمہاری ان حرکتوں کے باوجود تمہیں مہلت دیے جا رہا ہے۔

وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا (۴۵)

کفار کی قرآن سے بیزاری کا اصل سبب۔

یہ اس تعجب کو دور فرمایا ہے کہ قرآن جیسی واضح چیز، جس میں ایک ایک بات گوناگوں اسلوبوں سے، جیسا کہ آیت ۴۱ میں فرمایا، بیان ہوئی ہے، ان لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی ہے اور یہ اس سے اس درجہ وحشت زدہ کیوں ہیں؟ فرمایا کہ یہ لوگ نہ آخرت کو مانتے ہیں اور نہ آخرت کو ماننا چاہتے ہیں۔ یہ چیز ان کے دلوں پر ایک مخفی حجاب بن کر چھا گئی ہے جس کا اثر یہ ہے کہ قرآن کے انوار ان کے دلوں پر منعکس نہیں ہو پاتے۔

وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا (۴۶)

'اکنۃ'، 'کنان' کی جمع ہے جس کے معنی پردہ کے ہیں۔ 'اَنْ یَّفْقَهُوْهُ' یعنی 'کَرَاهَةَ اَنْ یَّفْقَهُوْهُ'۔ 'ان' سے پہلے مضاف حذف ہو گیا ہے۔ 'وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا' کے بعد 'اَنْ یَّسْمَعُوْهُ' حذف ہے۔ قرینہ اس پر دلیل ہے۔

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیا ہے کہ وہ اس کو نہ سنیں۔ 'وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا' یہ ان کی قرآن سے وحشت کا دوسرا بڑا سبب ہے کہ چونکہ تم قرآن میں صرف اللہ واحد ہی کا ذکر سناتے ہو، ان کے مزعومہ معبودوں کو کوئی درجہ نہیں دیتے، اور یہ لوگ آخرت کی طرح توحید سے بھی بیزار ہیں اس وجہ سے قرآن کو سنتے ہی وحشت زدہ ہو کر پیٹھ پیچھے بھاگتے ہیں۔

ختم قلوب کی سنت الٰہی

آیت میں دلوں پر پردہ اور کانوں میں ثقل پیدا کرنے سے اشارہ اس سنت الٰہی کی طرف ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ختم قلوب کے عنوان سے ہوا ہے۔ ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری تفصیل کے ساتھ اس سنت الٰہی کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ یہاں اس کے اعادے میں طوالت ہو گی۔

نَّحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُونَ بِهِ إِذْ يَسْتَمِعُونَ إِلَيْكَ وَإِذْ هُمْ نَجْوَىٰ إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا (۴۷)

یعنی یہ قرآن کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تو کبھی اس کو سنتے نہیں کہ اس سے ان کو نفع پہنچے، یہ تو اگر سنتے ہیں تو اس غرض سے سنتے ہیں کہ کوئی بھلا اعتراض اور نکتہ چینی کا ہاتھ آئے اور اس کو وہ اس کے خلاف بدگمانیاں پھیلانے کے لیے لے اڑیں۔ فرمایا کہ ہم ان کی اس نیت کو بھی خوب جانتے ہیں اور ان کی ان سرگوشیوں کو بھی خوب جانتے ہیں جب یہ مسلمانوں کو قرآن سے برگشتہ کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ تم لوگ تو ایک بالکل خبطی اور سحر زدہ شخص کے پیچھے چل پڑے ہو۔

انظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا (۴۸)

'ضَرَبُ مَثَل' سے مراد یہاں فقرے اور پھبتیاں چست کرنا ہے۔ ملاحظہ ہو آیات ۸-۹ فرقان۔
مطلب یہ ہے کہ تم پر اور قرآن پر اعتراض کرنے کی کوئی راہ تو انھیں مل نہیں رہی ہے اس وجہ سے یہ بالکل کھوئے گئے ہیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ماننا چاہتے نہیں اور تردید کا کوئی پہلو ہاتھ نہیں آرہا ہے اس وجہ سے جس کے منہ میں جو کچھ آجاتا ہے، دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے وہی بک دیتا ہے۔ کوئی کاہن بتاتا ہے، کوئی مجنون، کوئی ساحر کہتا ہے کوئی مسحور۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے حواس باختوں کی باتوں پر صبر کرو اور ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اصل حقیقت بہت جلد ان کے سامنے آجائے گی۔

وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۴۹)

کفار کے آخرت سے بیزاری

یہ آخرت کے بارے میں ان کے استبعاد کو نقل فرمایا ہے کہ وہ بربیل استہزاء و طنز پوچھتے ہیں کہ کیا ہم جب سڑگل کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے!!

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۙ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا (۵۰-۵۱)

'قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۙ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ' فرمایا کہ ان کو جواب دے دو کہ ہڈیاں اور ریزے ریزے ہو جانا تو درکنار اگر تم پتھر یا لوہا بھی بن جاؤ یا ان سے بھی کوئی سخت تر چیز جو تمھارے خیال میں زندگی قبول کرنے کی صلاحیتوں سے بالکل خالی ہو، جب بھی تم از سر نو اٹھائے جاؤ گے۔

'فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا' فرمایا کہ تمھاری اس بات پر وہ کہیں گے کہ بھلا کون ہمیں اٹھائے گا؟ یہ استفہام انکاری ہے۔ یعنی وہ کہیں گے کہ بھلا سڑگل جانے کے بعد کون ہمیں دوبارہ اٹھا سکتا ہے!! اس کا جواب بتایا کہ 'قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ' ان سے کہہ دینا کہ وہی جس نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا، یہ جواب نہایت مختصر لیکن بھرپور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کو تمھیں عدم محض سے پیدا کرنے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئی، آخر تمھیں دوبارہ وجود میں لانے سے وہ کیوں عاجز ہو جائے گا۔

'فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ' 'انغاض' کے معنی سر ہلانے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے اس مسکت جواب کے بعد بھی یہ چپ رہنے والے اسامی نہیں ہیں بلکہ اس کے بعد باندازِ استہزاء وہ یہ سوال کریں گے کہ یہ کب ہوگا؟ اس کا جواب یہ بتایا کہ 'قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا' کہہ دیجیو کہ بہت ممکن ہے کہ اس کا وقت قریب ہی آلگا ہو۔ اس جواب کے اندر یہ حقیقت مضمر ہے کہ جہاں تک قیامت کے وقت کا تعلق ہے اس کا پتہ تو اللہ کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر کو بھی اس کا علم نہیں ہے لیکن جو چیز شدنی ہے وہ بہر حال شدنی ہے۔ وہ دیر سویر ہو کے رہے گی، اس کو محض اس بنیاد پر تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا ٹھیک ٹھیک وقت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ وقت تو اپنی موت کا بھی کسی کو معلوم نہیں ہے لیکن احمق ہی ہوگا جو اس کا اس بنا پر انکار کر بیٹھے کہ اس کو اس کا وقت معلوم نہیں ہے۔

یَوْمَ یَدْعُوْکُمْ فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا (۵۲)

اب یہ ان کو براہِ راست خطاب کرکے فرمایا کہ آج تو بہت اکڑتے ہو لیکن اس دن کو یاد رکھو جس دن پکار ہوگی اور تم اس پکار پر خدا کی حمد کرتے ہوئے دوڑو گے۔ اس دن سارے حجابات چاک ہو جائیں گے اور ایک ایک حقیقت آنکھوں سے نظر آجائے گی۔ نیز یہ مدت جو تمہارے اور قیامت کے درمیان حائل ہے اور تمہیں بہت طویل نظر آرہی ہے، اس دن ایسا محسوس کروگے کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ پڑے ہیں مطلب یہ کہ جو مرا بس سمجھو کہ اس کی قیامت سر پر کھڑی ہے اس لیے کہ برزخ میں جو زندگی گزرے گی اس کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا۔

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا (۵۳)

مسلمانوں کو حکمتِ تبلیغ کی تعلیم

اوپر کی آیات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس دور میں مخالفین نے طنز و تعریض کے تمام ترکش سنبھال لیے تھے، جب جب کوئی موقع گفتگو کا نکلتا مسلمانوں کی بھی تحقیر کرتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی گستاخی اور بدتمیزی سے پیش آتے۔ اوپر آیت ۴۷ میں اس کی ایک مثال گزر چکی ہے۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اس باب میں مسلمانوں کو ضروری ہدایات دے دی جائیں تاکہ وہ کفار کے رویہ سے متاثر ہوکر کوئی ایسا قدم نہ اٹھا بیٹھیں جو دعوت کے مزاج کے منافی ہو۔ فرمایا کہ میرے بندوں (مسلمانوں) سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہو، یعنی مخالفین کی بے ہودہ باتوں کا جواب دینے کی کوشش نہ کریں۔ صرف صحیح اور سچی بات پہنچا دینے کی کوشش کریں اور اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ شیطان جو انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، ہر وقت اس گھات میں لگا ہوا ہے کہ کب کوئی موقع ہاتھ آئے اور وہ وسوسہ اندازی کرکے سارے کام کو خراب کردے۔ بعینہٖ یہی ہدایت اسی طرح کے مواقع کے لیے سورہ نحل میں ان الفاظ میں گزر چکی ہے۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ۔ ۱۲۵۔ نحل۔ سورہ اعراف کی آیات ۱۹۰۔۲۰۱ میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا (۵۴)

دعوت کے معاملہ میں مومنین کی ذمہ داری

یہ دعوت کے معاملے میں مومنین اور پیغمبر کی ذمہ داری کی حد واضح فرمادی تاکہ کفار کے معاندانہ رویے سے ان کے دل تنگ نہ ہوں۔ فرمایا کہ یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ کون رحمت کا مستحق ہے اور وہ ہدایت پاکر رحمت کا مستحق ہوگا اور کون عذاب کا مستحق ہے اور وہ گمراہی پر جما رہے گا اور عذاب کا سزاوار ٹھہرے گا۔ پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کی ذمہ داری صرف دعوت کو پہنچا دینے کی ہے۔ ان پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لازماً سب کو مومن بنا ہی دیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم کوئی داروغہ تو ان پر مقرر نہیں ہوئے ہو کہ ان کے کفر و ایمان کے معاملے میں تمہیں جواب دہی کرنی ہو۔ تمہارے اوپر ذمہ داری صرف حق پہنچا دینے کی ہے وہ پہنچا دو، ماننا نہ ماننا ان کا

کام ہے اور اس کی پرستش خدا کے ہاں انھیں سے ہوتی ہے تم سے نہیں ہوتی ہے تو تم بلاوجہ زیادہ پریشان کیوں ہوتے۔

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (۵۵)

تفضیل انبیاء میں صحیح نقطۂ نظر

مباحثے کی گرما گرمی میں جو چیز سب سے زیادہ فتنہ کا سبب بنتی ہے وہ اپنے اپنے مقتداؤں کی متعصبانہ ترجیح و تفضیل ہے۔ جو جس کو مانتا ہے ساری فضیلت بس اسی کے ساتھ باندھ کے رکھ دیتا ہے، کسی دوسرے کے لیے کسی فضیلت کے تسلیم کرنے میں وہ اپنی سبکی اور شکست محسوس کرتا ہے۔ اس دور میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتنہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا یا اس کے اٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ یہود، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ میدان مخالفت میں اتر آئے اور وہ مخالفین کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔ یہود کو، جیسا کہ بقرہ آیت ۲۵۳ کے تحت گزر چکا ہے، اس فتنہ سے خاص دلچسپی تھی۔ قرآن نے اس فتنہ کا سر کچلنے کے لیے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ زمین اور آسمان میں جو ہیں سب سے اللہ ہی خوب واقف ہے، وہی جانتا ہے کہ کس کا درجہ کیا ہے اور کون کس مرتبہ پر سرفراز ہے۔ اس چیز کو دوسرے لوگ نہیں جانتے۔ رہا یہ سوال کہ نبیوں میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے تو اللہ نے اپنے بعض انبیاء کو بعض پر بعض اعتبارات سے فضیلت بخشی، مثلاً حضرت موسیٰؑ سے اللہ نے کلام کیا، حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ کو بینات عطا فرمائیں اور روح القدس سے ان کی تائید کی، حضرت داؤدؑ کو زبور عطا فرمائی۔ نبیوں کے باب میں یہی نقطۂ نظر صحیح ہے اور مسلمانوں کو اسی پر جمے رہنے کی تاکید ہوئی کہ وہ آنحضرت صلعم کے اختصاص و امتیاز کے جو پہلو ہیں ان کا بھی اظہار و اعلان کریں اور دوسرے نبیوں کے جو امتیازی پہلو ہیں ان کو بھی تسلیم کریں۔ اس مسئلے پر بقرہ آیت ۲۵۳ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ حضرت داؤدؑ کو جو زبور عطا ہوئی اس کا خاص امتیازی پہلو یہ ہے کہ آسمانی کتابوں میں یہی ایک کتاب منظوم شکل میں ہے، جو تمام تر حمد و تمجید کے نغمات پر مشتمل ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا (۵۶)

کلام کا تعلق اوپر کے مضمون سے

اوپر کی تین آیتیں، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، اثنائے کلام میں، بطور جملہ معترضہ، برسر موقع تنبیہ و ہدایت کے لیے آگئی تھیں، اب پھر کلام اپنے اصلی سلسلہ یعنی آیات ۵۱-۵۲ سے جڑ گیا۔ اوپر ارشاد ہوا تھا کہ جس ساعت کے ظہور کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو کیا عجب کہ اس کا وقت قریب آپہنچا ہو۔ اب یہاں فرمایا کہ جن کو تم خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہو اگر تمھارا گمان یہ ہے کہ وہ تمھاری مدد کریں گے تو ان کو بلا دیکھو، نہ وہ کسی مصیبت کو دور کر سکیں گے اور نہ یہی کر سکیں گے کہ کچھ دیر ہی کے لیے اس کا رخ کسی اور طرف موڑ دیں۔

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (۵۷)

یعنی جن فرشتوں کو یہ خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں وہ تو خود ہر وقت خدا کے قرب کی طلب میں سرگرم ہیں۔ وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور کیوں نہ ڈریں۔ تیرے رب کا عذاب چیز ہی

ایسی ہے کہ اس سے ہر شخص ڈرے اور بچے، خواہ وہ کتنا ہی عالی مقام ہو۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۵۸-۶۰

عذاب کے باب میں سنّتِ الٰہی

پیچھے آیت ۱۱ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جب مشرکین کو عذاب الٰہی سے ڈراتے تو وہ جھٹ عذاب کا مطالبہ شروع کر دیتے کہ جس عذاب کی روز دھمکی سنا رہے ہو اس کو لا کر دکھاتے کیوں نہیں۔ اب یہاں اوپر والی آیات میں اس کا ذکر آیا تو اس باب میں جو سنت الٰہی ہے اس کی وضاحت فرما دی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی طلب پر عذاب کی نشانیاں اگر نہیں دکھاتا تو کیوں نہیں دکھاتا ــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۸-۶۰

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِىْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِى الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ﴿۶۰﴾ ع ۶

ترجمۂ آیات ۵۸-۶۰

اور کوئی بستی ایسی نہیں ہے جس کو قیامت سے پہلے ہم ہلاک نہ کر چھوڑیں یا اس کو کوئی سخت عذاب نہ دیں۔ یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ اور ہم کو نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور ہم نے قوم ثمود کو ایک اونٹنی ایک آنکھیں کھول دینے والی نشانی دی تو انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اس کی تکذیب کر دی اور ہم نشانیاں بھیجتے ہیں تو ڈرانے ہی کے لیے بھیجتے ہیں۔ ۵۸-۵۹

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے کہا کہ تمھارے رب نے لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور وہ رویا جو ہم نے تم کو دکھائی اس کو ہم نے لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ ہی بنا دیا اور اس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت وارد ہوئی اور ہم تو ان کو ڈراتے ہیں لیکن یہ چیز ان کی غایت سرکشی میں اضافہ کیے جا رہی ہے۔ ۶۰

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِن مِّن قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا (۵۸)

'قَرْيَةٌ' سے مراد یہاں، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں، وہ مرکزی بستیاں ہیں جو کسی قوم کے اعیان و مترفین کا مرکز ہوتی ہیں۔

مطالبۂ نشانی عذاب کا جواب

یہ کفار قریش کے مطالبۂ نشانی عذاب کا جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچائیں، ہر بستی جو کفر و طغیان کی راہ اختیار کرے گی وہ دو حالتوں میں سے کسی ایک سے لازماً دوچار ہو کے رہے گی۔ یا تو ہم اس کو ہلاک کر چھوڑیں گے یا اس کو سخت عذاب دیں گے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی ہے لیکن اسی سورہ میں پیچھے وہ سنت الٰہی بھی بیان ہو گئی ہے جس کے تحت یہ بات واقع ہوتی ہے۔ آیت ۱۶ پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ۔ (۱۶۔ بنی اسرائیل)

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کر دینا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حالوں کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں، پھر ان پر بات پوری ہو جاتی ہے پھر ہم اس کو یک قلم نیست و نابود کر کے رکھ دیتے ہیں۔

یوں تو یہ سنت الٰہی ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی لیکن کفار قریش کے لیے یہ مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین اس وجہ سے بن گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں انہی کے اندر سے ایک رسول بھیج دیا تھا۔ رسول اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو ایک خاص مدت تک مہلت پانے کے بعد وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔

'كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا' یعنی یہ بات نوشتۂ الٰہی یا خدا کے دفتر میں مرقوم ہے۔ اس نے یہ لکھ رکھا ہے کہ فلاں قوم ان ان جرائم کی اپنے ارادہ و اختیار سے مرتکب ہو گی اور ان کی پاداش میں وہ یوں اپنے کیفر کردار

کو پہنچے گی۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا (۵۹)

نشانی نہ بھیجنے کی حکمت

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ حکمت و رحمت واضح فرمائی ہے جس کے سبب سے وہ لوگوں کے شدید مطالبہ کے باوجود کوئی نشانی عذاب نہیں بھیج رہا ہے۔ فرمایا کہ نشانیوں کا مقصد تو لوگوں کو ڈرانا اور متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ ان کو دیکھ کر اس عذاب الٰہی سے ڈریں جس سے ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے لیکن پچھلی قوموں نے اپنی شامت اعمال سے ہمیشہ یہ کیا کہ ان نشانیوں سے متنبہ ہونے کے بجائے ان کی تکذیب کر کے اپنے لیے انھوں نے عذاب الٰہی کا دروازہ کھول لیا۔

وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا 'ب' کا صلہ چونکہ 'ظَلَمُوْا' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا اس وجہ سے یہاں حذف مانیں گے یعنی 'ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَكَذَّبُوْا بِهَا' انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور ناقہ کے نشانی ہونے کی تکذیب کر دی۔

نشانیوں کی تکذیب کی ایک مثال

یہ مثال بیان ہوئی ہے اوپر والی بات کی کہ عذاب کی نشانیوں کی پچھلی قوموں نے کس طرح تکذیب کی ہے۔ فرمایا کہ ہم نے قوم ثمود کو ناقہ ایک آنکھیں کھول دینے والی نشانی کی حیثیت سے دی۔ اگر وہ ضد سے اندھے نہ ہو چکے ہوتے تو ان کے لیے وہ کافی تھی لیکن انھوں نے اس نشانی سے کوئی فائدہ اٹھانا تو درکنار ناقہ کی کوچیں کاٹ کر اس کو ہلاک کیا اور اس طرح خود اپنی ہلاکت کے لیے عذاب الٰہی کا دروازہ کھول لیا۔

'وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا' یعنی عذاب کی کوئی نشانی تو جب بھی ہم بھیجتے ہیں محض اصل عذاب سے متنبہ اور آگاہ کرنے کے لیے بھیجتے ہیں لیکن ہٹ دھرم لوگ اس سے قائل نہیں ہوتے، وہ اس کی کوئی نہ کوئی تاویل کر کے اپنی خرمستیوں کے لیے بہانہ پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ اگر کنکر برسا دینے والی ہوا (حاصب) کا کسی طرف سے طوفان اٹھے تو یہ کہیں گے کہ یہ تو ابر کرم ہے جو ہم پر برسنے والا ہے۔ اگر کوئی اور آفت ارضی یا سماوی نمودار ہو تو کہیں گے کہ قوموں پر ایسے نرم و سخت دن تو آیا ہی کرتے ہیں۔ غرض کوئی نشانی جس کا مقصود محض تخویف و تنبیہ ہو وہ تو ان کو قائل کرنے والی بن نہیں سکتی، یہ تو اگر قائل ہو سکتے ہیں تو اصل عذاب سے قائل ہو سکتے ہیں لیکن اس کے ظہور کے بعد قائل ہونے اور نہ ہونے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا (۶۰)

تنبیہی نشانیوں کے باب میں قریش کا رویہ

تخویفی و تنبیہی نشانیوں کے باب میں پچھلی قوموں کا جو رویہ رہا ہے اوپر کی آیات میں اس کی طرف اشارہ فرمایا۔ اب یہ خاص آنحضرت صلعم کی قوم کی بعض باتوں کا حوالہ دیا ہے جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اگر ان کی طلب پر ان کو بھی کوئی تخویفی نشانی دکھائی گئی تو ان کا رویہ بھی پچھلی قوموں سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ یہ بھی اس کی

تکذیب کر دیں گے اس لیے کہ اب تک جو باتیں ان سے تخویف و تنبیہ کے مقصد سے کہی گئی ہیں انھوں نے ان سب کا مذاق ہی اڑایا ہے۔ مثلاً جب ہم نے تم کو یہ خبر دی کہ تمھارے رب نے لوگوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے تو انھوں نے اس سے متنبہ ہونے کے بجائے اس کا مذاق اڑایا کہ تم دور کی لے رہے اور ڈینگیں مار رہے ہو۔

یہ اشارہ ان آیات کی طرف ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اب ہم کفار مکہ کے زور و اثر کو اس کے اطراف سے کم کرتے ہوئے مکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مثلاً سورۂ رعد میں ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ (۴۱ - رعد) — کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم سرزمین (مکہ) کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کے اطراف سے اس کو کم کرتے ہوئے۔

یہ بات اس وقت فرمائی گئی تھی جب اطراف مکہ میں اسلام پھیلنے لگا اور مکہ اور اہل مکہ گویا آہستہ آہستہ اسلام کے گھیرے میں آ رہے تھے۔ یہی مضمون آیت ۴۴۔ انبیاء میں بھی ہے۔ پھر جب فتوحات کا دور شروع ہوا تو قرآن نے فتح مکہ کی پیشین گوئی ان الفاظ میں فرمائی۔

وَّاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ (۲۱ - الفتح) — اور دوسری فتوحات بھی ہیں جن پر تم ابھی قادر نہیں ہوسکے لیکن اللہ نے ان کو اپنے احاطے میں لے لیا ہے۔

یہ باتیں ہوائی نہیں تھیں بلکہ حالات ان کی صاف پیشین گوئی کر رہے تھے لیکن قریش کے ضدی لیڈروں نے ان تمام تخویفات کا آخر وقت تک انکار ہی کیا یہاں تک کہ بالآخر انھیں مسلمانوں کے آگے گھٹنے ٹیک دینے پڑے۔

'وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ' یہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی دوسری مثال بیان ہوئی۔ فرمایا کہ جو رویا ہم نے تم کو دکھائی اس میں بھی ان کے لیے تخویف و تنبیہ مضمر تھی لیکن وہ بھی ان کے لیے فتنہ ہی بنی اور انھوں نے اس کا بھی مذاق ہی اڑایا۔

واقعہ معراج پر ردِ عمل

'رُءْیَا' سے یہاں اشارہ واقعۂ معراج کی طرف ہے جس کا ذکر سورہ کے شروع میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ اس واقعہ کے اندر قریش اور بنی اسرائیل دونوں ہی کے لیے یہ تنبیہ مضمر تھی کہ اب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں گھروں کی تولیت و امانت ان کے موجودہ خائن متولیوں سے چھین کر نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ پر ایمان لانے والوں کے حوالہ کی جانے والی ہے۔ لیکن اس تنبیہ سے دونوں میں سے کسی نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہر ایک نے طرح طرح سے اس کا مذاق اڑایا یہاں تک کہ جو چیز ان کی تنبیہ و تخویف اور ان کو ان کے مستقبل سے آگاہ کرنے کے لیے تھی وہ ان کی شامتِ اعمال سے ان کے لیے ایک فتنہ بن کے رہ گئی[1]۔

تنبیہات سے فائدہ نہ اٹھانے کی ایک اور مثال

'وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ' یہ تیسری مثال بیان ہوئی تنبیہات سے ان کے فائدہ نہ اٹھانے کی۔

---

[1] ہم پیچھے حضرات انبیاء کی رویا اور خواب کا فرق بھی واضح کر چکے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی رویا رویائے صادقہ ہوتی ہے۔ یہ وحی الٰہی کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ آنحضرت صلعم کو متعدد بڑے بڑے واقعات رویا ہی میں دکھائے گئے۔ رویا کے مشاہدات بسا اوقات آنکھوں کے مشاہدات سے زیادہ قابل اعتماد ہوتے ہیں۔

"الشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ" سے اشارہ شجرۂ زقوم کی طرف ہے جس کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ وہ دوزخ میں ہوگا۔ اس کو دوزخی بھوک سے بیتاب ہو کر کھائیں گے پھر اس پر پیاس سے بے تاب ہو کر کھولتا پانی پیاسے اونٹوں کی طرح پئیں گے۔ شجرہ کے لیے 'ملعونۃ' کی صفت 'مبارکۃ' کی ضد ہے۔ ایک تو شجرۂ مبارکہ ہوتا ہے جو اپنے سایہ، اپنی طراوت اور اپنے پھل ہر چیز سے خلق کو فیض پہنچاتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس شجرۂ ملعونہ ہوتا ہے جس میں نہ سایہ نہ پھل، صرف کانٹوں کا ڈھیر، کڑواہٹ اور زہر سے بھرا ہوا، خلق کے لیے ایک لعنت اور مصیبت ہوتا ہے۔ زقوم کی صفت یہی ہے۔

ظاہر ہے کہ دوزخ کے یہ احوال اس لیے سنائے گئے ہیں کہ غفلت کے ماتے لوگ متنبہ ہوں اور اس سے بچنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہوں آج کر لیں لیکن قریش کے لال بجھکڑوں نے اس تنبیہ و تخویف سے فائدہ اٹھانے کے بجائے، اس عالم کے حالات کو اس عالم کے حالات پر قیاس کر کے یہ نکتہ آرائی شروع کر دی کہ یہ دیکھو، یہ شخص آگ، پانی اور درخت سب کو ایک ہی جگہ جمع کیے دے رہا ہے! بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ آگ بھی ہو اور اس میں درخت بھی ہو، آگ بھی ہو اور اس میں پانی بھی ہو۔

"وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا": یعنی ہم تو ان کو ان باتوں سے مستقبل کے خطرات سے آگاہ کر رہے ہیں کہ یہ ان سے کچھ بچنے کی فکر کریں لیکن یہ چیزیں ان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹے ان کے اس طغیان کبیر ہی میں اضافہ کیے جا رہی ہیں جس میں یہ مبتلا ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن کے دماغ اتنے ٹیڑھے ہو چکے ہیں کہ سیدھی سے سیدھی بات بھی ان میں جا کر ٹیڑھی ہو جاتی ہے ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ ان کی طلب پر کوئی نشانی ان کو دکھا دی گئی تو یہ اس کو مان لیں گے۔ اس کو دیکھ کر بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے۔ یہ نشانیِ عذاب سے فائدہ اٹھانے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ اصل عذاب سے قائل ہونے والے لوگ ہیں جس کے ظہور کے بعد قائل ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

۱۲- آگے کا مضمون ——— آیات ۶۱-۶۵

استکبار کا اصل سبب

آگے ان لوگوں کے طغیان و استکبار کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ اس کا اصل سبب وہ نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ان کو عذاب کی کوئی نشانی نہیں دکھائی گئی بلکہ یہ ہے کہ اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا تو یہ نعمتوں کو پا کر اس کے شکر گزار بندے بننے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے۔ یہ روش اختیار کرنے میں انھوں نے ٹھیک ابلیس کے نقشِ قدم کی پیروی کی ہے اور ابلیس نے ذریت آدم کے بارے میں اپنا جو گمان ظاہر کیا تھا ان کے اوپر اپنے اس گمان کو حرف بحرف سچ کر دکھایا۔

آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۶۱-۶۵

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

ترجمۂ آیات ۶۱-۶۵

اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے نہیں کیا وہ بولا کہ کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا۔ اس نے کہا ذرا دیکھ تو اس کو جس کو تو نے مجھ پر عزت بخشی ہے اگر تو نے مجھے روز قیامت تک مہلت دے دی تو میں، ایک قدرے قلیل کے سوا، اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا۔ فرمایا، جا، جو ان میں سے تیرے پیرو بن جائیں گے تو جہنم تم سب کا پورا پورا بدلہ ہے۔ اور ان میں سے جن پر تیرا بس چلے ان کو اپنے غوغا سے گھبرا لے، ان پر اپنے سوار اور پیدل چڑھا لا، مال اور اولاد میں ان کا ساجھی بن جا اور ان سے وعدہ کر لے اور شیطان ان سے محض دھوکے ہی کے وعدے کرتا ہے۔ بے شک میرے اپنے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا اور تیرا رب کارسازی کے لیے کافی ہے۔ ۶۱-۶۵

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا (۶۱)

آدمؑ اور ابلیس کے اس ماجرے کے تمام اجزاء پر سورۂ بقرہ اور اعراف کی تفسیر میں بحث ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں ہم گفتگو سیاق و سباق کلام کی وضاحت ہی کی حد تک محدود رکھیں گے۔

کفار کے انکار کی اصل علت

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ان لوگوں کے انکار کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ ان کو عذاب کی کوئی نشانی نہیں دکھائی گئی بلکہ اس کی اصل وجہ ان کا استکبار ہے اور اس معاملے میں انھوں نے ٹھیک ٹھیک، اپنے امام ابلیس کی سنت کی پیروی کی۔ جس طرح اس کو جب حکم ہوا کہ آدمؑ کو سجدہ کرے تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ایک برتر مخلوق ہو کر ایک خاکی مخلوق کو کس طرح سجدہ کروں اسی طرح یہ لوگ بھی خدا کی نعمتیں پا کر سیادت و امامت کے پندار میں اندھے ہو گئے ہیں اور ان کا یہ پندار ان کو اجازت نہیں دے رہا ہے کہ وہ تمھیں رسول مان کر تمھاری برتری اپنے اوپر تسلیم کر لیں اور اپنی زعامت کے پندار سے دست بردار ہو جائیں۔

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا (۶۲)

'اَرَءَيْتَكَ' کا اسلوب خطاب طنز و تحقیر کے لیے بھی آتا ہے اور 'اِحْتَنَكَ الْجَرَادُ الْاَرْضَ' کے معنی ہوں گے کہ ٹڈی دل نے زمین کی ساری روئیدگی چٹ کر لی۔

قصۂ آدم و ابلیس کا سبق

یعنی آدمؑ و ابلیس کی یہ دشمنی ختم نہیں ہو گئی بلکہ یہ قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ اس نے جوش حسد میں خدا سے یہ مہلت مانگی تھی کہ اگر تو نے مجھے قیامت تک مہلت دے دی تو میں آدمؑ کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا اور یہ ثابت کر دوں گا کہ آدمؑ اور اس کی ذریت میرے اور میری ذریت کے مقابل میں کسی شرف کے حقدار نہیں ہیں۔

اس کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ جو ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ابلیس اور اس کی ذریات کے نرغے میں آئے ہوئے لوگ ہیں اور اس نے روز اول جو دعویٰ کیا تھا ان لوگوں کے معاملے میں اس نے وہ سچ کر دکھایا ہے۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا (۶۳)

یعنی ابلیس نے خدا سے قیامت تک کے لیے ذریت آدمؑ کو ورغلانے کی جو مہلت مانگی تھی خدا نے اس کو وہ مہلت دے دی کہ جا جو کچھ تجھے کرنا ہے کر، تیرا اور تیری پیروی کرنے والوں کا پورا پورا بدلہ چکا دینے کے لیے جہنم کافی ہے، یعنی تجھ کو یہ مہلت دینے سے کسی فرصت کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے کہ تمھاری سزا میں کوئی کسر رہ جائے گی اس لیے کہ جہنم ایسی چیز ہے کہ وہ ایک ہی ساتھ ساری کسر پوری کر دے گی۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (۶۴)

'اِسْتِفْزَاز' کے معنی گھبرا دینے اور پریشان کر دینے کے ہیں اور 'صوت' سے مراد یہاں شور و غوغا، ہنگامہ اور پروپیگنڈا ہے۔

ابلیس کی مہلت کی حد — ابلیس اور اس کی ذریات کو اضلال کی مہم چلانے کی جس حد تک مہلت ملی ہوئی ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے تاکہ لوگ اس کو کوئی آسان بازی نہ سمجھیں بلکہ جو اس کے فتنوں سے اپنے ایمان کو بچانا چاہتے ہوں وہ ہر وقت اس کا مقابلہ کرنے کے لیے چوکس رہیں۔

ابلیس کے فتنوں کی گوناگونی — وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ - یعنی جا، لوگوں کو صراط مستقیم سے ہٹانے کی مہم میں اپنے شور و غوغا، اپنے نعرے اور ہنگامے، اپنے ریڈیو اور سنیما، اپنے گانے بجانے، اپنے جلسوں اور جلوسوں، اپنی تقریروں اور اعلانات، اپنے اخبارات و رسائل اور اس قبیل کی ساری ہی چیزوں سے جو فائدہ اٹھا سکتا ہے اٹھالے اور جن کے قدم اکھاڑ سکتا ہے اکھاڑ دے۔

وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ - 'خیل' سواروں کی جماعت اور 'رجل' پیادوں کی ٹولی۔ یعنی اپنے لشکر ضلالت کے سواروں اور پیادوں کو بھی ان پر چڑھالا اور اس طرح بھی اگر تیرا بس چلے تو ان کو ایمان سے پھیرنے کی کوشش کر دیکھ۔ یہ ملحوظ رہے کہ سوار اور پیادے چڑھالانا محض استعارہ ہی نہیں ہے بلکہ امر واقعی بھی ہے سو وہ تمام جنگیں جو دشمنانِ اسلام نے اہل ایمان کو دینِ حق سے پھیرنے کے لیے برپا کی ہیں وہ سب اس میں داخل ہیں۔

وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ - یعنی جو مال اور اولاد ہم نے لوگوں کو بخشے ہیں تو اگر کر سکے تو جا کر ان میں ساجھی بن جا، تیرے پرستار ان میں تجھ کو شریک کریں گے، اپنے مال میں سے تیرا حصہ نکالیں گے، اپنی اولاد کے نام تیرے نام پر رکھیں گے اور بعض تیری رضا جوئی کے لیے ان کو قربان بھی کر دیں گے۔

وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا - یعنی تو ان کو نہایت لذیذ اور سنہرے وعدوں کے سبز باغ بھی دکھالے جن میں مبتلا ہو کر زندگی کی حقیقی ذمہ داریوں سے وہ بالکل فارغ ہو بیٹھیں۔ اس کے بعد یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا یعنی شیطان جتنے وعدے بھی کرتا ہے سب محض فریب ہوتے ہیں۔ مثلاً مشرکین عرب کا یہ وہم کہ ہم جن فرشتوں کو پوجتے ہیں وہ ہمیں خدا کا مقرب بنادیں گے یا یہود کا یہ وہم کہ ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں اس لیے ہمیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (۶۵)

ایمان پر جمے رہنے والوں کو تسلی — 'سُلْطَان' کے معنی اختیار اور قدرت کے ہیں۔ یعنی مذکورہ سارے فتنے برپا کرنے کی تو تجھے مہلت دی گئی لیکن تجھے یہ اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ میرے جو بندے میری بندگی پر قائم و ثابت قدم رہنا چاہیں ان کو زبردستی

برگشتہ کر دے، یہ ایمان پر جمے رہنے والوں کے لیے تسلی ہے کہ شیطان جو کچھ بھی کر گزرے لیکن یہ اختیار مطلق اس کو حاصل نہیں ہے کہ وہ جس کو چاہے ایمان سے پھیر دے۔ اختیار مطلق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔ پھر مزید تسلی کے لیے فرمایا کہ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا یعنی اللہ کے جو بندے شیطان کے فتنوں کے علی الرغم اپنے ایمان پر قائم رہنا چاہیں گے اور اپنے آپ کو پورے اعتماد کے ساتھ اپنے رب کے حوالے کر دیں گے خدا ان کا کارساز ہے اور وہ کارسازی کے لیے کافی ہے، وہ سخت سے سخت حالات کے اندر بھی اپنے بندے کی حفاظت فرمائے گا اور اس کے ایمان کو بچائے گا۔

ابلیس کو اختیار مطلق حاصل نہیں

۱۴۔ آگے کا مضمون —— آیات ۶۶-۷۲

آگے انسان کی اس حالت کی تمثیل ہے کہ جب وہ کسی مصیبت میں پکڑا جاتا ہے تب وہ خدا خدا پکارتا اور اسی کے آگے روتا اور گڑگڑاتا ہے لیکن جوں ہی اس مصیبت سے نجات پا جاتا ہے پھر اکڑنے اور سرکشی کرنے لگتا ہے۔ اسے یہ بات بالکل فراموش ہو جاتی ہے کہ اگر خدا چاہے تو اس کو پھر اسی حالت میں گرفتار کر سکتا ہے اور اس طرح گرفتار کر سکتا ہے کہ پھر اس سے کبھی رہائی نصیب نہ ہو۔ اس کے بعد دو گروہوں کی تمثیل ہے ایک ان لوگوں کی جو دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اس سے صحیح سبق حاصل کرتے ہیں اور دوسری ان لوگوں کی جو ہمیشہ اندھے بنے رہتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کا آخرت میں جو انجام ہوگا وہ بیان فرمایا۔ یہ ساری تصویر و تمثیل قریش کے کفار کی ہے جو قرآن کے مخاطب اول تھے لیکن یہی رویہ دوسرے سرکشوں کا بھی ہوتا ہے اس وجہ سے بات عام الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

سرکشوں اور غافلوں کی تمثیل

آیات ۶۶-۷۲

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴿۶۸﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ﴿۶۹﴾ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا

بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ﴿۷۰﴾ یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۱﴾ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۷۲﴾

ع ۱۰

ترجمۂ آیات ۶۶-۷۲

تمہارا رب وہی ہے جو تمہارے لیے سمندر میں کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو۔ بے شک وہ تمہارے حال پر بڑا مہربان ہے۔ اور جب تمہیں سمندر میں مصیبت پہنچتی ہے تو اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو سب غائب ہو جاتے ہیں۔ پھر جب وہ تم کو خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم اعراض کر بیٹھتے ہو اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ ۶۶-۶۷

کیا تم اس بات سے نچنت ہو گئے کہ وہ خشکی کی جانب تمہارے سمیت زمین کو دھنسا دے یا تم پر باد تند بھیج دے، پھر تم کسی کو اپنا کارساز نہ پاؤ۔ یا تم اس سے نچنت ہو گئے کہ تم کو دوبارہ اسی میں لوٹائے پھر وہ تم پر باد تند کا جھونکا بھیج دے پس وہ تمہاری ناشکری کی پاداش میں تم کو غرق کر دے اور تم اس پر ہمارا کوئی پیچھا کرنے والا اپنے لیے نہ پاؤ۔ ۶۸-۶۹

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی اور تری دونوں میں ان کو سواری عطا کی۔ اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی۔ اس دن کو یاد رکھو جس دن ہم ہر گروہ کو اس کے رہنما سمیت بلائیں گے۔ سو جن کو ان کا اعمال نامہ دہنے ہاتھ میں ملے گا وہ تو اپنے اعمال نامہ کو پڑھیں گے اور ذرا بھی ان کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ اور جو اس دنیا میں اندھا بنا رہے گا وہ آخرت میں بھی اندھا اور گمراہ تر ہوگا۔ ۷۰-۷۲

۱۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ‎﴿٦٦﴾‏ وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ الْإِنسَانُ كَفُورًا (۶۶-۶۷)

اللہ کی نعمتوں کی ناقدری

یہ تمثیل ہے اس بات کی کہ ہر نعمت جو انسان کو ملتی ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ملتی ہے، اس کا حق یہ ہے کہ انسان اس نعمت سے متمتع اور اپنے رب کا شکرگزار ہو لیکن یہ انسان کی عجیب بدبختی ہے کہ جب اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ خدا سے اکڑتا ہے اور ہر چیز کو اپنی سعی و تدبیر کا کرشمہ اور اپنے مزعومہ دیویوں دیوتاؤں کا فضل و کرم سمجھتا ہے لیکن جب کسی گردش میں آ جاتا ہے تو خدا خدا پکارنے لگتا ہے، اس وقت سارے دیوی دیوتا اس کو بھول جاتے ہیں۔ پھر جب اللہ اس گردش سے اس کو نجات دے دیتا ہے تو وہ پچھلی خرمستی اس پر عود کر آتی ہے اور خدا کو وہ پھر طاقِ نسیاں پر رکھ دیتا ہے۔

کشتی اور دریا کی ایک مثال

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کشتی اور دریا کے سفر کی مثال دی ہے کہ یہ خدا ہی کی قدرت ہے کہ ہزاروں ٹن کا وزنی جہاز سمندر کے سینے پر چلتا ہے۔ اللہ نے یہ انتظام اس لیے فرمایا ہے کہ انسان اپنے سفروں میں اس سے فائدہ اٹھائے اور خدا کے اس فضل و رحمت پر اس کا شکرگزار ہو لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب تک کشتی رواں دواں رہتی ہے اس وقت تک تو خدا کا اس کو کبھی خیال بھی نہیں آتا لیکن جب کشتی کسی طوفان میں گھر کر ہچکولے کھانے لگتی ہے تو اس وقت اس کو اپنی اکڑ بھی بھول جاتی ہے اور دوسرے دیوی دیوتا بھی بھول جاتے ہیں، اس وقت وہ صرف خدا ہی سے فریاد و استغاثہ کرتا ہے لیکن یہ حالت صرف اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کشتی گردابِ بلا میں رہتی ہے۔ جوں ہی کشتی اس گرداب بلا سے نکلی اور انسان نے خشکی پر قدم رکھا پھر نہ اسے مصیبت کی وہ ساعت یاد رہتی ہے اور نہ اس کو خدا سے اپنا رونا اور گڑگڑانا یاد رہتا۔

اس تمثیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ قریش کے سرکش لوگ تم سے عذاب کی جو نشانی مانگ رہے ہیں، اگر نشانی ان کو دکھا دی گئی تو یہ ایمان و ہدایت کی راہ اختیار کر لیں گے بلکہ جب مصیبت میں پھنسیں گے تو خدا خدا پکاریں گے لیکن اس سے چھوٹتے ہی پھر اپنی پچھلی بدمستیوں ہی میں مبتلا ہو جائیں گے ——— ایمان و ہدایت کی راہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کی صداؤں پر کان دھرے اور اپنی عقل کی رہنمائی کو قبول کرے، یہ لوگ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو عذاب کی کسی نشانی سے ان کو ہدایت کی راہ کس طرح مل جائے گی۔

أَفَأَمِنتُمْ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَكِيلًا (۶۸)

سرکشوں سے چند سوالات

اب یہ سوال فرمایا ہے کہ دریا سے خشکی میں آ جانے کے بعد خدا سے بے خوف اور بے پروا کیوں ہو جاتے ہو؟ کیا سمجھتے ہو کہ خدا کی خدائی دریا ہی تک محدود ہے، خشکی اس کی خدائی سے باہر ہے؟ اگر وہ خشکی میں

زمین کو تمھارے سمیت دھنسا دے یا تم پر کنکر پتھر برسا دینے والی باد تند بھیج دے جو تم کو اور تمھارے مکانوں کو تہس نہس کر کے رکھ دے تو آخر کون ہے جو تم کو خدا سے بچانے والا بن سکے گا۔

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا ﴿۶۹﴾

'قاصف' اور 'تبیع' کا مفہوم

'قَاصِف' کے معنی توڑ دینے والی اور 'تَبِیْع' کے معنی ناصر اور مددگار کے ہیں۔

یعنی تم ایک مرتبہ خدا سے چھوٹ جانے کے بعد یہ کیوں سمجھ بیٹھے کہ خدا سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گئے، آخر یہ بھی تو ممکن ہے کہ خدا تمھیں کفرانِ نعمت کی سزا دینے کے لیے پھر ایسے حالات پیدا کر دے کہ تمھیں دوبارہ پھر اسی سمندر سے سابقہ پیش آئے اور وہ تم پر ایسی باد تند بھیجے جو سب کچھ توڑ پھوڑ کر تمھیں غرق کر دے اور تمھارا کوئی حامی تمھاری حمایت میں ہمارا تعاقب کرنے والا نہ بن سکے! آگے آیت ۷۵ میں اسی مضمون کو یوں ادا فرمایا ہے۔ 'ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا'۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ﴿۷۰﴾

انسان کو اس کی ذمہ داری کی یاد دہانی

اب یہ انسان کو اس کی ذمہ داری یاد دلائی ہے کہ ہم نے انسان کو جو عزت بخشی ہے، خشکی اور تری دونوں میں اس کے لیے سواری کا جو انتظام کیا ہے، اس کو جو پاکیزہ رزق عطا کیا ہے اور اس کو اپنی بہت سی مخلوقات پر جو فضیلت دی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ ان نعمتوں کا حق پہچانے اور اپنے رب کی ان نعمتوں کو پا کر اس سے اکڑنے اور اس کی نعمتوں کی ناشکری کرنے کے بجائے اس کا شکر گزار اور فرماں بردار بندہ بنے۔ نعمت پا کر اکڑنا ابلیس کی سنت ہے اور اس کا جو حشر ہوا وہ معلوم ہے۔

'وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا' سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ انسان کو دوسری مخلوقات پر جو فضیلت حاصل ہے وہ کلی نہیں ہے۔ خدا کی مخلوقات میں ایسی مخلوقات بھی ہیں جن پر انسان کی فضیلت نہیں ہے۔

یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۱﴾

'اُنَاس' کے معنی انسانوں کے گروہ کے ہیں اور 'امام' سے مراد لیڈر اور پیشوا ہیں۔

جزا و سزا کے دن کی یاد دہانی

یہ اس دن کی یاد دہانی فرمائی ہے جس دن جزا اور سزا کی خدائی عدالت قائم ہو گی۔ فرمایا کہ اس دن ہم ہر گروہ کو ان کے لیڈروں اور پیشواؤں سمیت اپنے حضور حاضر ہونے کا حکم دیں گے۔ نیک بھی اپنے صالح پیشواؤں اور مقتداؤں کے ساتھ حاضر ہوں گے اور اشرار و مفسدین بھی اپنے ناہنجار لیڈروں کے ساتھ حاضر کیے جائیں گے۔ پھر نیکوں کو ان کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ پکڑائے جائیں گے اور بدوں کو ان کے بائیں ہاتھ میں۔ تو

جن کو ان کے اعمال نامے دہنے ہاتھ میں ملیں گے وہ ان کو پڑھیں گے اور وہ دیکھیں گے کہ ان کے ساتھ ذرہ برابر بھی ناانصافی نہیں کی گئی ہے۔ ان کی ایک ایک نیکی، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، سب درج ہے اور ہر ایک کا ان کو بھرپور صلہ بھی عطا ہوا۔ 'وہ ان کو پڑھیں گے' میں فعل اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی وہ خوش ہو ہو کر ایک ایک چیز کو پڑھیں گے اور اپنے رب کی ذرہ نوازی پر اس کے شکرگزار ہوں گے۔ یہاں اگرچہ اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ ان لوگوں کے تاثرات کیا ہوں گے جن کو ان کے اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے لیکن سیاق کلام سے خود یہ بات ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال نامے پڑھنے کے بجائے اپنے سر اور منہ پیٹیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی کہ ہمارے سارے اعمال نامے میں ایک نقطہ بھی روشن نہیں ہے، سب تاریکی ہی تاریکی ہے۔

ہر گروہ کو ان کے لیڈروں اور مقتداؤں کے ساتھ جمع کرنے میں اعزاز و تکریم کا پہلو بھی ہے اور اتمام حجت کا پہلو بھی۔ اتقیاء کے لیڈر تو یہ دیکھیں گے کہ الحمدللہ جس اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے انھوں نے بازیاں کھیلیں اس کا انجام اس شاندار صورت میں سامنے آیا اور اشرار کے لیڈر اپنی کارستانیوں کے انجام دیکھیں گے اور ان کی پیروی کرنے والے ان پر لعنت بھیجیں گے اور ان کے لیے، جیسا کہ دوسرے مقام میں تصریح ہے، دونے عذاب کا مطالبہ کریں گے۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۷۲)

اصحاب الشمال کا انجام

اصحاب الیمین کے بعد یہ اصحاب الشمال کا انجام بیان ہو رہا ہے کہ چونکہ یہ لوگ دنیا میں اندھے بنے رہے اس وجہ سے یہ آخرت میں بھی اندھے ہی اٹھیں گے اور اصل منزل سے جو دوری آج ان کو ہے وہ دوری آج کی نسبت کہیں زیادہ ہو جائے گی اس لیے کہ آخرت کے ظہور کے بعد ان کے لیے صراط مستقیم کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔

اس آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اصحاب الیمین کو جو مرتبہ و مقام حاصل ہو گا وہ اس بنا پر حاصل ہو گا کہ انھوں نے دنیا میں آنکھیں بند کر کے زندگی نہیں گزاری بلکہ ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور اللہ کی ایک ایک نشانی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

۱۶۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۷۳-۷۷

آنحضرت صلعم کو موقف حق پر جمے رہنے کی تاکید

آگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید ہے کہ مخالفین کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم اپنے موقف حق پر جمے رہو۔ یہ کتنا ہی زور لگائیں کہ تم قرآن میں ان کے حسب منشا کچھ ترمیم کر دو تو وہ تمھارے دوست اور ساتھی بن جائیں گے لیکن تم کو ایک شوشہ کے برابر بھی اس میں ترمیم و تغیر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمھاری مخالفت میں یہ زیادہ سے زیادہ جو کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ تم کو یہ اتنا تنگ کریں کہ تم یہ شہر چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤ۔ اگر ایسا ہوا تو پھر تمھارے بعد ان کو بھی اس شہر میں زیادہ ٹکنا نصیب نہ ہو گا۔ رسولوں کی ہجرت کے بعد ان کی قوموں کا جو حشر ہوا ہے وہی حشر ان

کا بھی ہوگا۔ اس کے بعد حصول صبر و استقامت کے لیے نماز خصوصاً تہجد کی تاکید ہوئی اور قرب ہجرت کی دعا تعلیم فرمائی گئی اور ہجرت کے ساتھ جو فتح وابستہ ہے اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا۔ آخر میں مخالفین کی بدبختی پر اظہار افسوس ہے کہ قرآن جیسی چیز جو سرتاسر شفا اور رحمت ہے، ان لوگوں کی شامتِ اعمال سے ان کے لیے موجبِ وبال بن گئی ـــ آیات کی تلاوت کیجیے

آیات ۷۳ - ۸۴

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾ ع ۸

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ڰ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾ وَقُلْ جَاۗءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰي شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾ ع ۹

ترجمۂ آیات ۷۳-۸۴

اور بے شک قریب تھا کہ تم کو فتنوں میں ڈال کر اس چیز سے ہٹا دیں جو ہم نے تم پر وحی کی ہے تاکہ تم اس سے مختلف ہم پر افترا کر کے پیش کرو، اور تب وہ تم کو اپنا گاڑھا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم نے تم کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ جھک پڑو۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم تم کو زندگی اور موت دونوں کا دوگنا عذاب چکھاتے پھر تم ہمارے مقابل میں اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔ ۷۳-۷۵

اور بے شک یہ اس سرزمین سے تمھارے قدم اکھاڑ دینے کے درپے ہیں تاکہ یہ تم کو یہاں سے نکال چھوڑیں۔ اور اگر ایسا ہوا تو تمھارے بعد یہ بھی ٹکنے نہ پائیں گے۔ ہم نے تم سے پہلے اپنے جو رسول بھیجے ان کے باب میں ہماری سنت کو یاد رکھو اور تم ہماری سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤگے۔ نماز کا اہتمام رکھو زوال آفتاب کے اوقات سے لے کر شب کے تاریک ہونے تک اور خاص کر فجر کی قرأت کا۔ بے شک فجر کی قرأت بڑی ہی حضوری کی چیز ہے۔ اور شب میں بھی تہجد پڑھو، یہ تمھارے لیے مزید برآں ہے۔ توقع رکھو کہ تم کو تمھارا رب مقام محمود داتھانا اٹھائے اور دعا کرو کہ اے میرے رب مجھے داخل کر عزت کا داخل کرنا اور مجھے نکال عزت کا نکالنا اور مجھے خاص اپنے پاس سے مددگار قوت نصیب کر۔ اور اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا اور باطل نابود ہونے والی چیز ہے۔ ۷۶-۸۱

اور ہم قرآن میں سے جو اتارتے ہیں وہ شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے اور ظالموں کے لیے یہ چیز ان کے خسارے میں ہی اضافہ کر رہی ہے اور انسان پر جب ہم اپنا انعام کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا اور پہلو بدل لیتا ہے اور جب اس کو مصیبت پہنچتی ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ کہہ دو کہ ہر ایک اپنی روش پر کام کرے گا تو تمھارا رب ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو صحیح تر راستہ پر ہیں۔ ۸۲-۸۴

۱۷-۱ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِن كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا ۝ وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ إِذًا لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا (۷۳-۷۵)

'یَفْتِنُوْنَکَ' یہاں 'یُصْرِفُوْنَکَ' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے جس کی طرف 'عَنْ' اشارہ کر رہا ہے مطلب یہ ہے کہ مخالفین نے اتنا زور باندھا تھا کہ قریب تھا کہ تم کو فتنوں اور آزمائشوں میں ڈال کر تم کو موقفِ حق سے ہٹا دیں لیکن اللہ نے تم کو اس فتنہ سے بچا لیا۔

کفار کی دعوتِ مصالحت کا جواب

رسولوں کی دعوت میں ایک مرحلہ یہ بھی آیا ہے کہ مخالفین نے جب یہ محسوس کر لیا ہے کہ اب یہ دعوت جڑ پکڑ چکی ہے، صرف اندھی بہری مخالفت سے اس کا بلانا ممکن نہیں رہا تو اس وقت انھوں نے یہ سیاسی چال چلی ہے کہ کوئی تجویز باہمی سمجھوتے کی پیش کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی یہ مرحلہ پیش آیا۔ مخالفین نے جب دیکھ لیا کہ اب یہ دعوت دلوں میں گھر کر رہی ہے تو ان کی بعض جماعتوں نے، روایات میں قبیلہ بنی ثقیف وغیرہ کا نام بھی آیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے یہ تجویز پیش کی کہ اگر فلاں فلاں احکام میں ترمیم کر دیں تو ہم یہ دعوت قبول کیے لیتے ہیں، پھر ہم اور آپ گہرے دوست بن کے رہیں گے[1]۔ یہ مرحلہ آنحضرت صلعم کے لیے بڑا ہی سخت تھا۔ ایک طرف اللہ کے اتارے ہوئے احکام تھے جن میں ایک نقطہ کے برابر بھی آپ ترمیم کرنے کے مجاز نہ تھے، دوسری طرف آپ اپنی قوم کے ایمان کے انتہائی حریص تھے اور کسی ایسے موقعے کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہتے تھے جس سے قوم کے ایمان کی راہ پر بڑھنے کی کچھ امید بندھتی ہو۔ اس صورتِ حال نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ 'لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ' کے الفاظ اسی تذبذب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس نازک مرحلے میں اپنے پیغمبر کی دست گیری فرمائی اور آپ کو تردد و تذبذب سے نکال کر صحیح شاہراہ پر کھڑا کر دیا۔

نبی کی عصمت کا مفہوم

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی کے معصوم ہونے کے معنی یہ نہیں کہ اس کو کوئی تذبذب کی حالت پیش نہیں آتی یا کوئی غلط میلان اس کے دل میں خطور نہیں کرتا بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اول تو اس کا میلان کبھی جانب نفس میں نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ جانبِ خیر میں ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ جانبِ خیر میں بھی اگر وہ کوئی ایسا قدم اٹھاتا نظر آتا ہے جو صحیح نہیں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اس کو بچا لیتا ہے اور صحیح سمت میں اس کی رہنمائی فرما دیتا ہے۔

خطاب نبی سے، عتاب کفار پر

'اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ...... الایۃ' ظاہر الفاظ کے اعتبار سے خطاب اگرچہ آنحضرت صلعم سے ہے لیکن اس میں جو زجر و عتاب ہے اس کا رخ سمجھوتے کی تجویزیں لانے والوں کی طرف ہے تاکہ وہ متنبہ ہو جائیں کہ جب اس قسم کے

---

[1] اسی سے ملتی جلتی بات مائدہ کی آیت ۴۹ میں بھی گزر چکی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

کسی اقدام پر خود پیغمبر کو دنیا اور آخرت میں دو گنے عذاب کی دھمکی ہے تو پھر اس کے برتے کا آنے کا کیا امکان رہا۔

'ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ' میں ایک مضاف محذوف ہے یعنی ضِعْفَ عَذَابِ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ عَذَابِ الْمَمَاتِ، اور یہ دو گنے عذاب کی دھمکی رسول کے درجے اور مرتبے کے اعتبار سے ہے۔ جن کے مرتبے جتنے ہی اونچے ہوتے ہیں اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور اسی اعتبار سے ان کی گرفت بھی ہوتی ہے اگر وہ کوئی غلطی کرتے ہیں۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (۷۶-۷۷)

'اِسْتِفْزَاز' کے معنی گھبرا دینے، پریشان کر دینے اور اکھاڑ دینے کے ہیں اور 'اَلْاَرْض' سے مراد یہاں سرزمین مکہ ہے۔

مخالفین جب سمجھوتے کی کسی تجویز کے بروئے کار آنے سے بھی مایوس ہو گئے تو ظاہر ہے کہ ان کی مخالفت جو پہلے بھی کچھ کم نہ تھی اس مایوسی کے بعد دو چند ہو گئی۔ انھوں نے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا کہ آپ کے قدم سرزمین مکہ سے اکھاڑ دیں کہ آپ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو انھوں نے یہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تو تمھارے بعد یہ بھی زیادہ ٹکنے نہ پائیں گے۔ تم سے پہلے جو ہم نے رسول بھیجے ان کی ہجرت کے بعد جو حشر ان کی قوموں کا ہوا وہی حشر لازماً ان کا بھی ہو گا۔ اس معاملے میں اللہ کی جو سنت پہلے سے چلی آرہی ہے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے معاملے میں وہ بدل جائے۔

رسول کی ہجرت تک قوم امون ہوتی ہے

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ رسول چونکہ اتمام حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے، نیز وہ جب تک قوم میں رہتا ہے اس کے لیے استغفار کرتا رہتا ہے اس وجہ سے اس کی موجودگی تک قوم کو اللہ کے عذاب سے امان حاصل رہتی ہے لیکن جب قوم کی روش سے تنگ آ کر وہ ہجرت پر مجبور ہو جاتا ہے تو قوم ایک بالکل جسد بے روح ہو کر رہ جاتی ہے اور اتمام حجت کا مرحلہ ختم ہو چکتا ہے۔ اس کے بعد یا تو اللہ کا کوئی عذاب نمودار ہوتا ہے جو غلاظت کے اس ڈھیر سے زمین کو صاف کر دیتا ہے یا اہل ایمان کی تلوار بے نیام ہوتی ہے اور وہ ان کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ اہل مکہ کے اشرار کے معاملے میں یہی دوسری صورت پیش آئی۔

'سُنَّةَ' میرے نزدیک 'يَوْمَ' وغیرہ کی طرح فعل محذوف سے منصوب ہے یعنی 'اُذْكُرْ سُنَّةَ مَنْ' ہم نے جو رسول تم سے پہلے بھیجے ان کے اور ان کی قوموں کے معاملے میں ہماری جو سنت رہی ہے اس کو یاد رکھو۔ اس اسلوب میں فی الجملہ تخصیص ذکر کا پہلو مضمر ہوتا ہے اور یہ براہ راست اصل چیز کو نگاہ کے سامنے کر دیتا ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (۷۸)

'اِقَامَتِ صَلٰوة' کا مفہوم صرف نماز پڑھنا ہی نہیں بلکہ نماز کا اہتمام کرنا ہے۔

نمازوں کے اوقات

'دُلُوْك' کے معنی زوال کے ہیں۔ سورج کے زوال کے تین درجے ہیں۔ ایک وہ جب وہ سمت راس سے ڈھلتا

ہے، دوسرا جب مرئی العین سے نیچے کی طرف جھکتا ہے، تیسرا جب وہ افق سے غائب ہوتا ہے۔ یہ تینوں اوقات ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں کے ہیں۔ 'دُلُوْك' پر 'لِ' وقت کے مفہوم میں ہے۔ اس معنی کے لیے یہ عربی میں معروف ہے۔ جس مفہوم کو ہم لفظ 'پر' سے ادا کرتے ہیں بعض مواقع میں وہی مفہوم 'لِ' ادا کرتا ہے۔ مثلاً 'اَلصَّلٰوةُ لِاَوْقَاتِهَا' کے معنی ہوں گے نماز اس کے اوقات پر۔ 'اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ' نماز کا اہتمام کرو زوال آفتاب پر۔

'غَسَقِ الَّیْلِ' اول شب کی تاریکی جب کہ وہ گاڑھی ہو جائے۔ یہ نماز عشا کا وقت ہے۔

'وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ' اس کو اگرچہ 'اَقِمْ' کے تحت بھی رکھ سکتے ہیں لیکن میرے نزدیک اس کا نصب تخصیص ذکر کے پہلو سے ہے یعنی 'اَخُصُّ بِالذِّکْرِ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ' اس تخصیص ذکر سے نماز فجر کی خاص اہمیت واضح ہوتی ہے۔

'اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا' 'قرآن' سے مراد یہاں نماز فجر میں قرآن کی تلاوت ہے۔ یہ لفظ یہاں فی الجملہ طول قراءت کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے اور جہر قراءت کی طرف بھی۔ 'مَشْهُوْدًا' سے اس حضور قلب و دماغ کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے جو خاص طور پر نماز فجر میں امام اور مقتدیوں دونوں کو حاصل ہوتا ہے اور ملائکہ کی اس حاضری کی طرف بھی جو اس وقت مبارک کی برکات میں سے ہے اور جس کا ذکر احادیث میں آیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دن رات میں پانچ نمازوں اور ان کے اوقات کا ذکر خود قرآن میں ہے۔ بلکہ آگے والی آیت سے معلوم ہو گا کہ تہجد اور اس کے وقت کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ اتنی واضح آیات کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہے کہ قرآن میں پانچ وقت کی نمازوں کا کوئی ذکر نہیں ہے تو ایسے سرپھرے لوگوں کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔

اشیائے کائنات کا رکوع و سجود

نمازوں کے اوقات کے تعین میں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی بڑی نشانیوں کے رکوع و سجود کے اوقات کو ملحوظ رکھا ہے۔ زیر بحث آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ سورج شب و روز کے تمام اوقات میں قیام، رکوع اور سجود میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام چیزوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے جن پر سورج کا عکس پڑتا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ اپنے رب کے آگے برابر قیام، رکوع اور سجود میں رہتی ہیں۔ 'ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ' اور 'اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ' وغیرہ آیات میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ تمام مخلوقات اپنی صورت و ہیئت سے انسان کو گویا دعوت دیتی ہیں کہ جس طرح وہ خدا کے آگے رکوع و سجود کرتی ہیں اسی طرح وہ بھی ان کا ہم آہنگ ہو کر اپنے رب کی نماز پڑھے لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ وہ کائنات کی مخلوق میں سے تو حقیر سے حقیر چیزوں کے آگے گھٹنے اور ماتھے ٹیکتا ہے لیکن اپنے اس رب حقیقی سے اکڑتا ہے جس کے آگے اس کی مسجود چیزیں بھی ہر وقت رکوع و سجود میں ہیں۔ اسی آفتاب کو لیجیے جس کے رکوع و سجود کا یہاں ذکر ہے، کون اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ دنیا میں کتنا پجا ہے اور کتنا پج رہا ہے۔

نماز حصول صبر و استقامت کا ذریعہ

یہاں نماز کے اس اہتمام کی تاکید، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اس مشکل مرحلہ میں حصول صبر و استقامت کے لیے ہے جو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو درپیش تھا۔ راہ حق میں جو سخت مراحل آزمائش

کے پیش آتے ہیں ان میں حق پر استقامت اللہ کی معیت کے بغیر ممکن نہیں اور اللہ کی معیت کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ نماز بالخصوص تہجد کی نماز ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۷۹)

'تہجد' سے مراد

'تہجد' کے معنی لغت میں تو شب میں کچھ سونے کے بعد اٹھنے کے ہیں لیکن اصطلاح قرآن میں اس سے مراد وہ نماز ہے جو شب میں کچھ سونے کے بعد اٹھ کر پڑھی جائے۔ 'بہٖ' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے اور ضمیر مجرور کا مرجع 'لیل' ہے۔

'نافلۃ' کا مفہوم

'نَافِلَةً' اصل پر جو شے زائد ہو اس کو کہتے ہیں۔ اس کا استعمال کسی نعمت و رحمت پر زیادتی کے لیے ہوتا ہے، کسی بار اور مصیبت پر زیادتی کے لیے نہیں ہوتا یعنی یہ نماز ان پنج وقتہ نمازوں پر تمھارے لیے مزید ہے۔ 'لَكَ' سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے یہ نماز آپؐ کے لیے ضروری تھی۔ چنانچہ آپؐ نے زندگی بھر اس کا اہتمام رکھا۔ نمازوں کے اس اہتمام کی تاکید، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، شیطانی قوتوں کے مقابلہ کے لیے حصول قوت کے مقصد سے تھی۔ اسی مقصد کے لیے یہ تہجد کے اہتمام کی تاکید ہوئی اور اس کی نسبت فرمایا گیا کہ نَافِلَةً لَّكَ لیعنی یہ تمھارے لیے مزید کمک کے طور پر ہے جو راہ حق کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے تمھارے صبر و ثبات میں مزید اضافہ کرے گی۔ عام امتیوں کے لیے یہ نماز اگرچہ ضروری نہیں ہے لیکن جو لوگ شیطانی قوتوں کا مقابلہ کرنے اور حق کو دنیا میں برپا کرنے کے لیے اٹھیں ان کے لیے خدا کی نصرت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی نماز ہے۔ چنانچہ امت کے صالحین نے جنھوں نے اس دنیا میں دین کی کوئی خدمت کرنے کی توفیق پائی ہے، اس نماز کا ہمیشہ اہتمام رکھا ہے۔

'عَسٰى' کا لفظ اصلاً امید و رجا، توقع اور ظن غالب کے اظہار کے لیے آتا ہے لیکن جب یہ اللہ تعالیٰ کی نسبت کے ساتھ آئے تو اس صورت میں امید و رجا کا تعلق اللہ تعالیٰ کے بجائے مخاطب یا متکلم سے ہو جائے گا مثلاً عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۸ - اسرآء' کا ترجمہ ہوگا، تم توقع رکھو کہ اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۸۳ - یوسف' کا ترجمہ ہوگا، میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لائے گا۔ اسی طرح 'عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا' کا ترجمہ ہوگا، تم امید رکھو کہ خدا تمھیں محمود اٹھانا اٹھائے گا۔ اس توجیہ سے وہ شبہ رفع ہو جاتا ہے جو عربیت سے ناآشنا لوگ اٹھاتے ہیں کہ خدا کے نزدیک تو ہر چیز معلوم و معین ہے تو اس کی طرف توقع اور ظن و گمان کی نسبت کے کیا معنی؟ آگے کسی موزوں مقام پر ہم واضح کریں گے کہ 'لعلّ' اور اس کے ہم معنی الفاظ و حروف بھی جب خدا کی نسبت سے آتے ہیں تو ان میں بھی وہی مفہوم ہوتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔

مقام محمود

'مَقَامًا مَّحْمُوْدًا'۔ 'مقام' ہمارے نزدیک ظرف کے معنی میں نہیں بلکہ مصدر کے معنی میں ہے اور یہ یہاں مفعول مطلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ چونکہ لفظ 'بعث' اور 'مقام' میں معنی کا اشتراک موجود ہے اس لیے کہ 'بعث' کے معنی اٹھانے اور 'مقام' کے معنی کھڑے ہونے اور اٹھنے کے ہیں اس وجہ سے اس کے مفعول مطلق واقع ہونے میں

کوئی قباحت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو تمھاری مخالفت و مذمت میں یہ شور و غوغا برپا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے لیکن تم اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہو، نمازوں بالخصوص تہجد کا خاص اہتمام کرو اور یہ توقع رکھو کہ تمھارا رب تمھیں اس حال میں اٹھائے گا کہ ایک عظیم امت کی زبانوں پر تمھارے لیے ترانۂ حمد ہوگا اور عنداللہ بھی تمھاری ساعی محمود و مشکور ہوں گی۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (۸۰)

لفظ 'قُل' یہاں دعا کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ آیا ہے۔ ملاحظہ ہو آیت ۲۹۔ مومنون۔

لفظ 'صِدْقٍ' کی اصل روح، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، عزت، رسوخ اور استحکام ہے۔ 'سُلْطٰن' کے معنی غلبہ اور تمکن کے ہیں۔

قربِ ہجرت کا اشارہ اور ایک عظیم بشارت

اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ حالات اتنے سخت ہو چکے تھے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ سے ہجرت ناگزیر ہو چکی تھی لیکن اللہ کا رسول اللہ کے اذن کے بغیر ہجرت نہیں کرتا۔ اس وجہ سے آنحضرت صلعم اپنی دعوت اور اپنے مقام پر ڈٹے رہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ آپ کو یہ دعا تلقین کی گئی جس میں نہ صرف یہ کہ قربِ ہجرت کی طرف اشارہ ہے بلکہ یہ بشارت بھی مضمر ہے کہ آپ کے نکلنے سے پہلے ہی آپ کے داخل ہونے کا انتظام کر لیا گیا ہے، آپ کا نکلنا اور داخل ہونا دونوں عزت و وقار اور رسوخ و استحکام کے ساتھ ہوگا اور یہ کہ اس سفر میں غلبہ اور نصرتِ الٰہی کا خاص عنایت بدرقہ آپ کے ہم رکاب ہوگا۔ دعا میں 'اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ' کا 'اَخْرِجْنِیْ' پر مقدم ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمھارے داخلہ کا انتظام تمھارے نکلنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے اور 'مِنْ لَّدُنْكَ' کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ گو ظاہری حالات کیسے ہی ناسازگار و مخالف ہوں لیکن تمھارا رب اپنے پاس سے تمھارے لیے سارے انتظام فرمائے گا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری الفاظ کے اعتبار سے تو یہ ایک دعا ہے جو آپ کو تلقین فرمائی گئی ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک عظیم بشارت ہے جو نہایت ہی پرخطر حالات میں آپ کو دی گئی۔ پھر ہجرت کے سفر کی سرگزشت اور مدینہ میں حضورؐ کے داخلہ کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ خلق نے اس بشارت کے ایک ایک لفظ کو عملاً ظہور میں آتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۸۱)

'حق' سے مراد قرآن اور وہ دینِ حق ہے جس کو لے کر قرآن آیا تھا اور باطل سے مراد وہ دین باطل ہے جس کو مٹانے کے لیے قرآن نازل ہوا تھا۔

حق کی فتح اور باطل کی شکست کا اعلان

اوپر آپ کو ہجرت کی دعا سکھائی گئی تھی اب یہ انھیں نازک حالات کے اندر حق کی فتح اور باطل کی شکست کے اعلان کا آپ کو حکم ہوا۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں کہ ہجرت درحقیقت رسول کی فتح کا دیباچہ ہوتی ہے۔ اس کے بعد رسول کے مخالفین لازماً مٹ جاتے ہیں اور دینِ حق کا بول بالا ہو کے رہتا ہے۔

'اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی فطرت کے اندر باطل کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ خود رو جھاڑیوں کی طرح اس وقت پھیلتا ہے جب اس کو صاف کرنے والے موجود نہیں ہوتے ہیں۔ جب اس کو صاف کرنے والے آموجود ہوتے ہیں تو حالات کے اعتبار سے گو انھیں مشقت اٹھانی پڑتی ہے لیکن بالآخر یہ نابود ہو کے رہتا ہے اور اس کی جگہ وہ کشتِ حق لہلہا اٹھتی ہے جس کا تخم اہلِ حق ڈالتے ہیں اس لیے کہ انسانی فطرت کی زمین درحقیقت فاطرِ فطرت نے اسی کشتِ حق کی پرورش کے لیے بنائی ہے نہ کہ اس خار و خس کی پرورش کے لیے جو محض غفلت کی پیداوار ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر یہ پیشین گوئی عملاً پوری ہو گئی۔ اس وقت آنحضرت صلعم نیزے کی انی سے خانۂ کعبہ کے بتوں کو توڑتے جاتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے گویا اس آیت کا مصداق منصۂ شہود پر آگیا۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا ھُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَلَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

قرآن کی تکذیب کرنے والوں کی محرومی

یہ قرآن کی تکذیب کرنے والوں کی محرومی اور شامت زدگی پر اظہارِ افسوس اور ملامت ہے کہ ہم تو قرآن میں سے جو کچھ اتار رہے ہیں اس میں ان کے تمام روحانی و عقلی روگوں کا مداوا اور نتیجہ اور عاقبت کار کے اعتبار سے یہ ان کے لیے سرتا سر رحمت ہے لیکن جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں یہی چیز ان کے لیے مزید خسارے کا باعث بن رہی ہے کہ وہ اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کر کے اپنے آپ کو دنیا اور آخرت دونوں میں شدید عذاب کا مستحق بنا رہے ہیں۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِہٖ ۚ وَاِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ کَانَ یَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

'اَلْاِنْسَان' کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن یہاں اس سے مراد قریش کے وہی اشرار و مفسدین ہیں جن کا کردار زیرِ بحث ہے۔ انھوں نے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے متکبرانہ اعراض کی روش اختیار کی، جیسا کہ 'اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِہٖ' کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے منہ پھیر کر عام صیغہ سے بات فرمائی۔ 'اَعْرَضَ' کے بعد 'وَنَاٰ بِجَانِبِہٖ' کے الفاظ سے ان کے اعراض کی تصویر سامنے آ رہی ہے۔ کسی چیز سے اعراض شائستہ انداز میں بھی ہو سکتا ہے لیکن جب انسان نفرت، بیزاری اور غرور کے انداز میں کسی چیز سے اعراض کرتا ہے تو وہ پہلو بدل لیتا اور مونڈھے پھیر لیتا ہے۔

فرمایا کہ انسان کا عجیب حال ہے۔ جب ہم اس پر اپنا فضل و انعام کرتے ہیں تب وہ ہم سے اکڑتا اور سرکشی کرتا ہے لیکن اس کے اعمال کی پاداش میں جب ہم اس کو کسی مصیبت میں گرفتار کر لیتے ہیں تو وہ دل شکستہ اور مایوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے لیے صحیح روش یہ تھی کہ ہمارے انعام پر ہمارا شکر گزار ہوتا اور کوئی آزمائش پیش آتی تو اس پر صبر کرتا۔ مطلب یہ ہے کہ یہی حال ہے تمھارے ان مخالفین کا۔ ہم نے ان کو اپنے فضل سے نوازا ہے تو ان کے غرور کا یہ حال ہے کہ تمھاری دعوت و تذکیر پر تم سے عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اگر ہم نے ان کو دھر لیا تو پھر سارا نشہ ہرن ہو جائے گا اور یاس و نامرادی کی تصویر بن کر رہ جائیں گے۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا (۸۴)

لفظ 'کل' اگرچہ نکرہ ہے لیکن بعض مواقع میں، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، یہ معرفہ کے حکم میں ہو جاتا ہے یعنی اس سے وہی جماعتیں یا اشخاص مراد ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہوتا ہے۔

معاملہ اللہ کے حوالہ کرنے کی ہدایت

'شاکلۃ' کے معنی طریقہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر تم میری بات سننے پر آمادہ نہیں ہو تو تم اپنی روش پر گامزن رہو گے اور میں بہر حال اپنی دعوت پر قائم رہوں گا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ سیدھے راستے پر کون ہے، اپنے زعم کے مطابق تم یا میں اور میرے ساتھی۔ آگے آنے والے حالات بتا دیں گے کہ منزل پر کون پہنچتا ہے۔ یہ آیت گویا تفویض کی آیت ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی کہ تم ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو اور خود اپنے موقف حق پر ڈٹے رہو۔

۱۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۸۵-۱۱۱

مخالفین کے اعتراضوں کے جواب

آگے مخالفین کے ان اعتراضات کا جواب ہے جو وہ قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے خلاف اٹھاتے تھے۔ ساتھ ہی ان مطالبات کا حوالہ بھی ہے جو وہ اپنے ایمان لانے کی شرط کے طور پر پیش کرتے تھے۔ ان مطالبات کو نقل کر کے ان کے جواب بھی دیے ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی بھی کہ جن کے اندر علم کا نور ہے وہ اس کتاب پر ایمان لا رہے ہیں، رہے وہ لوگ جو طرح طرح کے معجزات کے مطالبے کر رہے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں ـــ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۸۵-۱۱۱

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۸۵) وَلَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا (۸۶) اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا (۸۷) قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۸۸) وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۡ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (۸۹) وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا (۹۰) اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ

تُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ
عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ
مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۚ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ
عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۚ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

ع ۹ ۱۰

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ
اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ
لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ
وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ
الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا
خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا

النصف

ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ
يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ
مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾
قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ
الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ

ع ۱۱

بَيِّنٰتٍ فَسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ
لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾
فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾
وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْکُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ
وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِکُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ
نَزَلَ ۗ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ (وقف لازم)
لِتَقْرَاَهٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ
اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ۚ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ
یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّیَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ کَانَ وَعْدُ
رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَیَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ (السجدة)
قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۗ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ
الْحُسْنٰی ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَیْنَ
ذٰلِکَ سَبِیْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ
یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ
کَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾ ع ۱۲ ۱۱ ۱۲

ترجمہ آیات ۸۵-۱۱۱

اور وہ تم سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم میں سے
ہے اور تمھیں تو بس تھوڑا ہی سا علم عطا ہوا ہے۔ اور اگر ہم چاہیں تو اس وحی کو سلب کر
لیں جو ہم نے تم پر کی ہے، پھر تم اس کے لیے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار بھی نہ پا سکو گے۔ یہ
تو بس تمھارے رب کا فضل ہے۔ بے شک اس کا فضل تم پر بہت بڑا ہے۔ کہہ دو کہ اگر تمام انس و جن

اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس جیسا قرآن لادیں تو وہ اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ ۸۵-۸۸

اور ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں طرح طرح سے ہر قسم کی حکمت کی باتیں بیان کی ہیں لیکن اکثر لوگ انکار ہی پر اڑے ہوئے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم تو تمھاری بات ماننے کے نہیں جب تک تم ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ نہ جاری کر دو یا تمھارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو جائے پھر تم اس کے بیچ بیچ میں نہریں نہ دوڑا دو یا تم ہم پر آسمان سے ٹکڑے نہ گرا دو جیسا کہ تم دعوٰی کرتے ہو یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے نہ لا کھڑا کر دو یا تمھارے پاس سونے کا کوئی گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تمھارے چڑھنے کو بھی ماننے کے نہیں جب تک تم وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتار دو جسے ہم پڑھیں — کہہ دو کہ میرا رب پاک ہے، میں تو بس ایک بشر ہوں، اللہ کا رسول۔ ۸۹-۹۳

اور ان لوگوں کو ایمان لانے سے، جب کہ ان کے پاس ہدایت آگئی، نہیں مانع ہوئی مگر یہ چیز کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے ایک بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجا۔ کہہ دو، اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر اتارتے۔ کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے، بے شک وہی اپنے بندوں کو خوب جاننے والا ہے، خوب دیکھنے والا ہے۔ اور جس کو اللہ ہدایت دے گا وہی ہدایت پانے والا بنے گا اور جسے وہ گمراہ کر دے گا تو تم ان کے لیے اس کے سوا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے اور ہم قیامت کے دن ان کو ان کے مونہوں کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے اکٹھا کریں گے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب جب اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اس کو مزید بھڑکا دیا کریں گے۔

یہ ان کا بدلہ ہوگا اس بات کا کہ انھوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے۔ کیا انھوں نے نہیں سوچا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ قادر ہے کہ ان کے مانند پھر پیدا کر دے اور اس نے ان کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن یہ ظالم انکار ہی پر اڑے رہے۔ ۹۸-۹۹

کہہ دو کہ اگر میرے رب کے فضل کے خزانوں کے مالک تم ہوتے تو اس وقت تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ہاتھ روک لیتے اور انسان بڑا ہی تنگ دل ہے۔ ۱۰۰

اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ میں تو تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ تجھے خوب معلوم ہے کہ ان کو آسمانوں اور زمین کے رب ہی نے اتارا ہے آنکھیں کھول دینے کے لیے اور میں تو تم کو اے فرعون ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ ان کے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دے تو ہم نے اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو غرق کر دیا۔ اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم ملک میں رہو بسو، پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کر کے لائیں گے۔ ۱۰۱-۱۰۴

اور ہم نے اس کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے اور ہم نے تم کو صرف ایک بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور قرآن کو تو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے اتارا کہ تم اس کو لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤ اور ہم نے اس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، وہ لوگ جن کو اس کے پہلے سے علم ملا ہوا ہے جب یہ ان کو سنایا

جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ شدنی تھا اور وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گرتے ہیں اور یہ ان کے خشوع میں اضافہ کرتا ہے۔ ۱۰۵-۱۰۹

کہہ دو کہ اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔ اور تم اپنی نماز کو نہ زیادہ جہری کرو اور نہ بالکل ہی سرّی، ان دونوں کے بین بین کا راستہ اختیار کرو۔ اور کہو کہ شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس کے نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اس کی پادشاہی میں اس کا کوئی ساجھی ہے اور نہ اس کو ذلت سے بچانے کے لیے کسی مددگار کی حاجت ہے اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ۱۱۰-۱۱۱

۱۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۸۵)

روح سے مراد

'رُوْح' سے مراد یہاں وحی الٰہی ہے۔ وحی الٰہی کو روح سے تعبیر کرنے میں یہ اشارہ مضمر ہے کہ جس طرح جسم کی زندگی روح سے ہے اسی طرح روح و عقل اور دل کی زندگی وحی الٰہی سے ہے۔ اس حقیقت کو سیدنا مسیحؑ نے یوں واضح فرمایا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے، قرآن کو اسی پہلو سے جگہ جگہ روح سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (۲-نحل)	وہ اتارتا ہے فرشتوں کو روح کے ساتھ اپنے امر میں سے جن پر چاہتا ہے ان بندوں میں سے۔
يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ (۱۵- غافر)	وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے روح القا کرتا ہے اپنے امر میں سے تاکہ وہ لوگوں کو ملاقات کے دن سے ہوشیار کردے۔
وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (۵۲- الشوریٰ)	اور اسی طرح ہم نے تمھاری طرف وحی کی روح اپنے امر میں سے۔

روح کے متعلق سوال کا جواب

کفار اسی روح سے متعلق سوال کرتے اور ان کا یہ سوال تحقیق کی غرض سے نہیں بلکہ محض اعتراض و استہزاء کے

ارادہ سے ہوتا۔ یعنی نعوذ باللہ ان کے سوال کا مطلب یہ ہوتا کہ یہ روح کیا بلا ہے جس کے تم اپنے اوپر اترنے کے مدعی ہو، ذرا اس کی حقیقت ہمیں بھی تو سمجھاؤ۔ جواب میں فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ روح میرے رب کے امر ہی سے ہے اور تمہیں علم تھوڑا ہی ملا ہے، یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ تم اس کائنات، اور اس کے خالق کے سارے ہی بھید سمجھ جاؤ۔ اس روح کو وہی سمجھتے ہیں جن کو اس کا تجربہ ہوا ہے۔ جس کے درد جگر نہ ہوا ہو وہ اگر درد جگر کو دیکھنے کے لیے مچلے تو اس کو یہ درد کس طرح دکھایا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔

ان مخالفین قرآن کے ذہن میں یہ سوال کرتے وقت، یہ بات بھی مخفی ہوتی کہ آخر تمہارے ہی اوپر یہ روح کیوں اترتی ہے، ہمارے اوپر کیوں نہیں اترتی؟ ان کے اسی مافی الذہن کو سامنے رکھ کر اوپر کی آیات میں عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ کے الفاظ آئے ہیں، یعنی اس شرف کا مستحق ہر بوالہوس نہیں ہوتا، اس کے لیے اللہ ہی جس کو چاہتا ہے انتخاب فرماتا ہے۔

'مِنْ اَمْرِہٖ' اور 'مِنْ اَمْرِنَا' کے الفاظ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہیں کہ یہ چیز امور الٰہیہ میں سے ہے جس کی اصل حقیقت خدا ہی جانتا ہے۔ ہر شخص اس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا (۸۶ - ۸۷)

وحی کی حالت ایک تصرف غیبی ہے

اس آیت کا خطاب، اگرچہ آنحضرت صلعم کی طرف ہے لیکن بات جو فرمائی گئی ہے اس کو انہی لوگوں کو سنانا مقصود ہے جن کا اوپر سوال نقل ہوا ہے فرمایا کہ یہ وحی کی حالت و کیفیت تو تمہارے لیے بھی ایک بالکل اضطراری کیفیت و حالت ہے جس میں تمہارے اختیار و ارادہ اور تمہاری خواہش و کوشش کو کوئی دخل نہیں ہے۔ نہ تم اس کو اپنے ارادے سے لا سکتے اور نہ اپنے ارادے سے روک سکتے۔ یہاں تک کہ اگر ہم اس وحی کو سلب کر لیں جو ہم نے تم پر کی ہے تو کوئی طاقت ایسی نہیں جو تم کو یہ واپس دلا سکے، یہ محض ہمارا تصرف غیبی ہے جس سے تمہیں یہ چیز حاصل ہوتی ہے اور صرف ہمارا فضل ہے جس سے ہم نے تم کو سرفراز کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ تمہارے رب کا تمہارے اوپر بہت ہی بڑا فضل ہوا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا (۸۸)

ظاہر ہے کہ جب خود پیغمبر کی خواہش و کوشش کو بھی اس وحی کے لانے میں کوئی دخل نہیں ہے اور وہ بھی اپنے اختیار و ارادے سے اس قسم کی کتاب پیش کرنے پر قادر نہیں درآنحالیکہ انہی کے واسطہ سے یہ ظہور میں آئی ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔ دوسروں کی کیا تاب و مجال ہے کہ اس قرآن کے مثل کوئی کتاب لا سکیں، انسان تو درکنار اگر انسان اور جنات دونوں آپس میں گٹھ جوڑ کر کے یہ زور لگائیں کہ اس طرح کی کوئی کتاب پیش کریں جب بھی وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتے ــــ قرآن کا یہ چیلنج کم و بیش چودہ سو سال سے موجود ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ

عرب و عجم میں سے کوئی اس کو قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور اگر کسی نے اس کی نقالی کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے آپ کو مضحکہ بنانے سے محفوظ نہ رکھ سکا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا (۸۹)

قرآن کے ذریعے اتمام حجت

'تَصْرِیف' کے معنی یہاں ایک ایک حقیقت کو مختلف اسلوبوں اور گوناگون پیرایوں سے بیان کرنا ہے اور 'ضَرْبِ مثل' سے مراد حکمت و معرفت کی بات کہنا ہے۔ عربی میں اس مفہوم کے لیے اس محاورہ کا استعمال معروف ہے۔ کسی حماسی کا شعر مشہور ہے۔

یا ابن دو الامثال یضربہا لذی اللب الحکیم

اے بدرہ حکمت کی باتیں حکیم عاقل ہی کے لیے بیان کرتا ہے

مطلب یہ ہے کہ اس معجز کتاب کے نازل ہو جانے کے بعد، جس میں حکمت کی ایک ایک بات گوناگوں اسلوبوں اور پیرایوں سے ہم نے بیان کی ہے ان لوگوں کے پاس یہ عذر باقی نہیں رہا کہ ان کے پاس خدا کی کوئی ہدایت نہیں آئی۔ اس کتاب نے ان پر حجت تمام کر دی ہے۔ اگر اس کے بعد بھی لوگوں کی اکثریت انکار ہی پر اڑی ہوئی ہے تو یہ ان کی اپنی محرومی و بدبختی ہے۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ۔ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۔ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۔ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (۹۰-۹۳)

مخالفین کے مطالبات برائے تصدیق رسالت

'ایمان' کا صلہ جب 'ل' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ایمان لانے کے نہیں بلکہ مجرد کسی بات کے ماننے اور باور کرنے کے ہوتے ہیں۔ اب یہ مخالفین کے وہ مطالبات نقل ہو رہے ہیں جن کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کے لیے بطور شرط کے پیش کرتے تھے۔ وہ مطالبات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ یہ کہ دیکھتے دیکھتے آپ زمین سے ایک چشمہ جاری کر دیں۔

۲۔ یا یہ کہ آپ کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جائے اور آپ اس کے بیچ بیچ میں بہت سی نہریں نکال دیں۔

۳۔ یا یہ کہ آپ ہم پر آسمان کے کچھ ٹکڑے گرا دیں جیسا کہ آپ کا دعویٰ ہے یا یہ کہ اللہ اور فرشتوں کو رو در رو دکھا دیں ('بایتہ قبیلا' کے معنی ہوں گے 'ہا بیتہ عیانا و مقابلۃ)۔

۴۔ یا یہ کہ آپ کے پاس ایک سونے کا مکان ہو جائے یا آپ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے اس آسمان پر چڑھنے کو بھی اس وقت تک باور نہیں کریں گے جب تک آپ وہاں سے ہم پر کوئی کتاب نہ اتاریں جس کو ہم پڑھیں۔

مطالبات کا جواب

ان سارے مطالبات کے جواب میں ارشاد ہوا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ ان سے کہہ دو کہ میرا رب، ہر قسم کی شرکت سے پاک ہے، میں تو بس ایک بشر اور رسول ہوں۔ یعنی میں نے خدائی یا خدائی میں شرکت کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ تم مجھ سے اس قسم کے مطالبے کرتے ہو، میرا رب، ہر قسم کی شرکت سے منزہ، ارفع اور بالاتر ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں اور خدا کا ایک رسول۔ رسول کی حیثیت سے میرا فریضہ صرف یہ ہے کہ میں تم کو خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ ان کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی کر دینے کا مجھے اختیار نہیں ملا ہوا ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (۹۴)

انسانوں کے لیے انسان کے نبی ہونے کی حکمت

'اَلْهُدٰی'، یعنی اللہ کی واضح ہدایت، اپنے تمام دلائل و براہین کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اللہ کی ہدایت کا تعلق ہے وہ تو نہایت، واضح شکل میں، اپنے ناقابلِ تردید دلائل کے ساتھ، ان کے سامنے آچکی ہے۔ اب تو اگر کسی چیز کو اپنے ایمان نہ لانے کے بہانے کے طور پر پیش کر رہے ہیں تو وہ صرف یہ چیز ہے کہ کیا ایک بشر کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے! یعنی جہاں تک، دلائل کا تعلق ہے اس سے انکار کی کوئی گنجائش تو باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن ان کا کبر و غرور اس بات سے مانع ہے کہ وہ ایک بشر کو اپنا رسول مان لیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (۹۵)

یعنی اگر ان کا یہ خیال ہے کہ کسی بشر کے بجائے کسی فرشتے کو ان کی طرف رسول ہو کر آنا تھا تو ان سے کہہ دو کہ اگر زمین میں انسانوں کے بجائے فرشتے رہتے بستے ہوتے تب تو ہم اگر ان کی طرف رسول بھیجتے تو لازماً آسمان سے کوئی فرشتہ ہی اتارتے لیکن جب زمین میں انسان رہتے بستے ہیں تو آخر انسانوں کی طرف کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی؟ رسول اس لیے آتا ہے کہ اس کی زندگی لوگوں کے لیے اسوہ اور نمونہ بنے۔ آخر کسی فرشتہ کی زندگی انسانوں کے لیے اسوہ اور نمونہ کس طرح بن سکتی ہے؟

'مَلٰٓئِكَةٌ' کے ساتھ 'يَمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ' کی قید سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ زمین میں فرشتے آتے جاتے تو ہیں لیکن وہ خدا کے حکم کے تحت اس کی کسی مشیت کی تنفیذ کے لیے آتے جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت یہاں کے مستقل باشندوں کی نہیں ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِیْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا (۹۶)

معاملہ اللہ کے حوالہ کرنے کی ہدایت

اب یہ اچھی طرح حجت تمام کر دینے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کر دو اور ان سے کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی دینے کے لیے کافی ہے کہ دلائل کی عدم وضاحت تمہارے لیے ایمان سے مانع ہے یا تمہاری ضد اور انانیت۔ اللہ اپنے بندوں کے ظاہر و باطن سے خوب واقف ہے۔ اب وہی فیصلہ فرمائے گا کہ تم پر میری رسالت کی صداقت واضح نہیں ہوئی تھی یا تم سب کچھ دیکھ، سن اور سمجھ کر اندھے بہرے اور گونگے بنے رہے۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ

وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (۹۷)

ہدایت وضلالت کے باب میں سنت الٰہی

یہ ہدایت وضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت واضح فرما دی کہ اللہ ہی جس کو ہدایت دیتا ہے وہ ہدایت پاتا اور وہ جس کو گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی بھی ہدایت دینے والا نہیں بن سکتا۔ یہ سنت الٰہی جس اساس پر مبنی ہے اس کی طرف 'وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ جو لوگ اپنی آنکھیں اللہ کی نشانیاں دیکھنے کے لیے، اپنی زبانیں حق کی گواہی کے لیے اور اپنے کان اللہ اور رسول کی باتیں سننے کے لیے استعمال کرتے ہیں ان کو تو خدا کی طرف سے ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو یہ سب کچھ رکھتے ہوئے اندھے، بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں ان کو خدا کی ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کا چونکہ یہی حال ہے اس وجہ سے ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوگی اور قیامت کے دن ان کو ان نعمتوں کی ناقدری کی سزا ہم یہ دیں گے کہ ان کو ہم ان کے مونہوں کے بل اس حال میں گھسیٹتے ہوئے اکٹھا کریں گے کہ یہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے 'نَحْشُرُهُمْ' کے بعد 'عَلٰى' اس بات پر دلیل ہے کہ یہ مونہوں کے بل گھسیٹتے ہوئے اکٹھے کیے جائیں گے۔ دوسری جگہ 'يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ' کے الفاظ وارد ہوئے جن سے اس مضمون کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ وہ چہرے جن کو اللہ نے سمع وبصر اور نطق کی صلاحیتوں سے مزین فرمایا لیکن اس کے باوجود وہ اندھے، بہرے اور گونگے ہی بنے رہے بلاشبہ وہ اسی قابل ہیں کہ ایسی بھڑکتی آگ پر گھسیٹے جائیں جس کی لو کبھی دھیمی نہ ہونے پائے۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۹۸)

فرمایا کہ یہ سزا ان کو اس لیے دی جائے گی کہ قدم قدم پر ہماری قدرت اور حیات بعد الممات کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود وہ قیامت کے انکار ہی پر اڑے رہے اور بڑے طنطنہ کے ساتھ یہ کہتے رہے کہ کیا جب ہم ہڈیاں ہو جائیں گے اور سڑگل کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو بھلا از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟ یعنی ان کے خیال میں یہ بالکل ناممکن اور محال ہے۔ فرمایا کہ ہم اسی محال کو واقعہ بنا کر ان کو اس کا مزہ چکھائیں گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا (۹۹)

قیامت کے لیے وقت مقرر ہے

یعنی ان کو آخر دوبارہ اٹھائے جانے میں اتنا استبعاد کیوں نظر آتا ہے؟ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جو خدا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں قاصر رہ جائے گا؟ کیا ان کو دوبارہ پیدا کرنا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے؟

'وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ' رہا یہ سوال کہ قیامت آنی ہے تو آ کیوں نہیں جاتی تو اس کے لیے جلدی نہ مچائیں۔ خدا نے اس کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا، وہ یوم موعود بھی آجائے گا۔ 'فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا' یعنی اتنے واضح دلائل کے باوجود یہ اپنی جانوں

پر ظلم ڈھانے والے لوگ اس کے لیے تیاری کرنے کے بجائے اس کے انکار ہی پر اڑے ہوئے ہیں۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۰۰)

کفار کی متکبرانہ ذہنیت پر ضرب

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اس تمام ردو انکار میں قریش کے لیڈروں کی اس متکبرانہ ذہنیت کو بھی بڑا دخل تھا کہ جب دنیا کی تمام نعمتیں ہمیں ملی ہیں تو خدا اگر نبوت و رسالت کے منصب پر کسی کو سرفراز کرنے والا ہوتا تو ہم ہی میں سے کسی کو سرفراز کرتا، آخر یہ منصب جلیل ہم سادات کو چھوڑ کر اس غریب آدمی کے حوالہ کیوں کر دیتا۔ ان کی اسی متکبرانہ ذہنیت کو سامنے رکھ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ ان سے کہہ دیں کہ اگر میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک تم ہوتے تب تو بلاشبہ تم اس کے تنہا اجارہ دار بن بیٹھتے اور اپنے سوا اس میں سے کسی کو بھی اس ڈر سے کچھ نہ دیتے کہ مبادا یہ ختم ہو جائے لیکن اپنے فضل و رحمت کے خزانوں کا مالک میرا رب خود ہی ہے اس نے جن خزف ریزوں کا اہل تم کو پایا وہ تمہارے حوالے کیے اور جس فضل عظیم کے لیے میرا انتخاب فرمایا تمہارے اور بنی اسرائیل کے علی الرغم، اس سے مجھ کو نوازا۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا، میں انسان کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن اشارہ انہی لوگوں کی طرف ہے کہ اگر یہ تنگ دل ہیں، اپنے سوا ان کے دل میں کسی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو آخر خدا کو انھوں نے اپنے جیسا کیوں گمان کر رکھا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا (۱۰۱)

مطالبۂ معجزات کا جواب

اوپر آیت ۹۰ سے ۹۳ تک ان معجزات کا ذکر گزر چکا ہے جن کا قریش مطالبہ کرتے تھے۔ یہ اسی مطالبہ کا جواب ہے کہ ایمان و ہدایت کی راہ معجزات سے نصیب نہیں ہوتی۔ ہم نے موسیٰؑ کو فرعون کی طلب پر نو نہایت کھلے کھلے معجزے دیے لیکن فرعون نے یہ سارے معجزے دیکھ کر کہا تو یہ کہا کہ اے موسیٰ میں تو تم کو ایک سحر زدہ آدمی سمجھتا ہوں۔ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس کے اثر سے تم اس قسم کی بہکی بہکی باتیں میرے سامنے کرنے لگے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح تمھیں بھی اگر تمھاری طلب کے مطابق معجزے دکھا دیے گئے تو تم بھی کوئی نہ کوئی بات بنا لو گے۔

حضرت موسیٰؑ کی مثال

'فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ' میں ایک لطیف تلمیح ہے۔ وہ یہ کہ اس مرحلے میں بنی اسرائیل اسلام کی مخالفت کی مہم میں پوری طرح شریک ہو گئے تھے اور قریش یہ معجزات کے مطالبے زیادہ تر انہی کی شہ پر کرتے تھے۔ وہ قریش کو یہ سکھاتے تھے کہ ہمارے پیغمبر نے تو یہ یہ معجزے دکھائے تو یہ اگر نبوت کے مدعی ہیں تو یہ بھی اسی طرح کے معجزے دکھائیں۔ ان کی اسی حرکت کے سبب سے قرآن نے انہی کو گواہ بنا کر پیش کیا کہ ان کے نبی نے معجزے دکھائے تو بھی لیکن انہی سے پوچھو کہ یہ سارے معجزے دکھانے کا نتیجہ کیا نکلا؟ اگر نتیجہ یہی نکلا کہ فرعون اور اس کی قوم غرق ہو کے رہی تو آخر یہ راستہ وہ قریش کو کیوں دکھاتے ہیں۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ

يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا - ۱۰۲

حضرت موسیٰؑ کا جواب فرعون کو

'مَثْبُوْرًا' کے معنی ہلاکت زدہ کے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو جواب بالکل ترکی بہ ترکی دیا۔ فرمایا کہ تجھے خوب معلوم ہے کہ یہ معجزے کسی سحر و شعبدہ کے کرشمے نہیں ہو سکتے۔ ان کی نوعیت ہی گواہی دیتی ہے کہ ان کو اتار سکتا ہے تو آسمانوں اور زمین کا رب ہی اتار سکتا ہے اور اسی نے تیری آنکھیں کھول دینے کے لیے ان کو اتارا ہے۔ اگر ان کو دیکھنے کے بعد بھی تیری آنکھیں نہیں کھلیں تو تجھ پر اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور میں سمجھتا ہوں کہ اب تیری ہلاکت کا وقت، اے فرعون! سر پر آ پہنچا ہے۔

فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا (۱۰۳)

چنانچہ اس کے بعد اس نے اپنا پورا زور صرف کر دیا کہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کے قدم سرزمین مصر سے اکھاڑ دے اور اس کی سزا اس کو یہ ملی کہ خدا نے اس کو اور اس کے سارے ساتھیوں کو غرق کر دیا۔

وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا (۱۰۴)

فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل پر انعام

فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل پر انعام ہوا کہ اللہ نے ان کو ارض مقدس میں بسا لیا۔ 'الْاَرْض' سے مراد یہاں قرینہ دلیل ہے کہ ارض مقدس ہے جس کا بنی اسرائیل سے وعدہ تھا۔ اس وعدے کو پورا کرتے وقت اللہ نے ان کو آخرت کا وعدہ بھی یاد دلا دیا تھا کہ اس کامیابی کی خوشیوں میں آخرت کو نہ بھول جانا۔ جس طرح اپنے وعدے کے مطابق ہم تم کو سمیٹ کر یہاں لائے ہیں اسی طرح اپنے وعدے کے بموجب ایک دن سمیٹ کر حساب کتاب کے لیے حشر کے میدان میں جمع کریں گے۔ لیکن بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی اس یاد دہانی کو بالکل بھول گئے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا (۱۰۵)

دعوت کے معاملہ میں نبی کی ذمہ داری

یہ بات ذہن میں محفوظ رہے کہ یہ سلسلہ بحث اصلاً وحی و قرآن کے ذکر سے چلا تھا۔ پھر اسی سے متعلق بعض دوسرے مسائل زیر بحث آ گئے۔ اب یہ مسائل ختم ہوتے تو اصل مسئلہ کو پھر لے لیا۔ فرمایا کہ ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ اتارا ہے اور یہ حق ہی کے ساتھ اترا ہے۔ کسی باطل کی کوئی آمیزش نہ اس میں آگے سے ہوئی ہے نہ پیچھے سے۔ اگر ایسے بے آمیز حق کو بھی یہ لوگ طرح طرح کے شبہات کا ہدف بنا رہے ہیں تو تمہارے اوپر ایسے سر پھرے لوگوں کے ایمان و ہدایت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ تم صرف ایک مبشر و نذیر ہو۔ اپنا انذار و تبشیر کا فرض ادا کر کے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر یہ تمہاری بات نہیں سنیں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰي مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (۱۰۶)

قرآن کے تدریجاً اترنے کی حکمت

یعنی یہ قرآن جو جستہ جستہ اتر رہا ہے تو اس وجہ سے نہیں، جیسا کہ یہ سمجھتے ہیں کہ تم حالات کے مطابق سوچتے ہو اور جتنا تیار کر پاتے ہو اتنا سنا دیتے ہو، بلکہ یہ ہم ہی جستہ جستہ کر کے اس کو تم پر اتار رہے ہیں تاکہ تم اس کو

بالتدریج لوگوں کو سناؤ کہ یہ لوگوں کے فکر و عمل کا جزو بنتا جائے۔ اگر ان کا یہ گمان ہے کہ یہ خدائی کتاب ہوتی تو لازماً پوری کی پوری بیک دفعہ نازل ہو جاتی اس لیے کہ خدا کو کسی تیاری کی ضرورت نہیں تھی تو یہ گمان بھی صحیح نہیں ہے۔ خدا کو تو بلاشبہ کسی اہتمام و تیاری کی حاجت نہیں ہے، وہ چاہتا تو پوری کتاب ایک ہی وقت میں نازل کر دیتا لیکن اس نے بندوں کی ضرورت اور ان کے حالات کا لحاظ فرمایا اور اس کو نہایت تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارا ہے۔ 'تَنۡزِیۡل' کا مفہوم، جیسا کہ ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں، تدریج و اہتمام کے ساتھ اتارنا ہے۔

قُلۡ اٰمِنُوۡا بِہٖۤ اَوۡ لَا تُؤۡمِنُوۡا ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِہٖۤ اِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ یَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ۙ وَّ یَقُوۡلُوۡنَ سُبۡحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنۡ کَانَ وَعۡدُ رَبِّنَا لَمَفۡعُوۡلًا ﴿۱۰۸﴾ وَ یَخِرُّوۡنَ لِلۡاَذۡقَانِ یَبۡکُوۡنَ وَ یَزِیۡدُہُمۡ خُشُوۡعًا (۱۰۷-۱۰۹)

صالحین اہل کتاب کا طرز عمل

'اَلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِہٖۤ' سے یہاں مراد قرینہ دلیل ہے کہ اچھے اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب میں جس طرح اشرار و مفسدین تھے جو اپنا ایڑی چوٹی کا زور قرآن کی مخالفت میں صرف کر رہے تھے اسی طرح ایک گروہ ایسے صالحین کا بھی تھا جو اپنے نبیوں اور صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی روشنی میں ایک رسول اور ایک کتاب موعود کا منتظر تھا۔ اس گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لائے ہوئے صحیفہ کے اندر ان پیشین گوئیوں کی جھلک دیکھی جن کے ظہور کے لیے وہ چشم براہ تھا۔ چنانچہ ان کا حال یہ تھا کہ ان کو جب قرآن سنایا جاتا تو یہ بے تحاشا سجدے میں گر پڑتے اور اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کے پورے ہونے پر دل و جان سے اس کا شکر بجا لاتے۔ یہ اسی مبارک گروہ کی طرف اشارہ ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت ہوئی ہے کہ تم قریش اور بنی اسرائیل کے مکذبین کو سنا دو کہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ میرے اطمینان کے لیے یہ کافی ہے کہ اہل علم کا ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو اس قرآن کو سن کر بے تحاشا سجدے میں گر پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ایفائے وعدہ کو دیکھ کر اس پر گریۂ مسرت و شکر اور گریۂ خشوع کی دوگونہ کیفیت و حالت طاری ہو جاتی ہے۔ گریۂ شکر و مسرت کا پہلو تو اس میں ظاہر ہی ہے، زیادت خشوع کا اس میں یہ پہلو ہے کہ اس سے آخرت کے وعدے کی از سر نو یاد دہانی ہوئی ہے کہ جس رب نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا لازماً وہ اپنا آخرت کا وعدہ بھی پورا کر کے رہے گا۔

قُلِ ادۡعُوا اللّٰہَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَیًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ۚ وَ لَا تَجۡہَرۡ بِصَلَاتِکَ وَ لَا تُخَافِتۡ بِہَا وَ ابۡتَغِ بَیۡنَ ذٰلِکَ سَبِیۡلًا (۱۱۰)

قرآن پر ایک اعتراض کا جواب

جب کسی چیز کے خلاف شبہ اور بدگمانی جڑ پکڑ لے تو اس سے تعلق رکھنے والی ان چیزوں پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے جن کے اندر کسی ادنیٰ شبہ کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ اہل عرب زمانۂ جاہلیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے اللہ اور رحمان دونوں نام استعمال کرتے تھے۔ کلام جاہلیت میں یہ دونوں ہی نام ملتے ہیں۔ البتہ

اتنی بات ضرور تھی کہ اسم رحمان زیادہ معروف اہل کتاب کے ہاں تھا۔ عرب کے ذہینوں نے یہیں سے اس نام کو بھی قرآن پر اعتراض کا بہانہ بنا لیا۔ انھوں نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ اس کتاب کی تیاری میں اس شخص کو (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو) اہل کتاب میں سے کچھ لوگ مدد دیتے ہیں۔ قرآن میں ان کا قول وَاَعَانَہٗ عَلَیْہِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ جو نقل ہوا ہے اس سے ان کا اشارہ اسی گروہ کی طرف ہوتا تھا۔ بعد میں جب اسم رحمان کی طرف ان کی توجہ ہوئی تو اس کو انھوں نے اپنے گمان کی تائید میں پیش کرنا شروع کر دیا کہ دیکھو تو یہ شخص اپنے پیش کردہ کلام میں رحمان کا نام بہت لاتا ہے جو اہل کتاب سے اس کے تعلق کی دلیل ہے اور پھر یہیں سے انھوں نے یہ نتیجہ نکال لیا ہوگا کہ یہ ہمارے مذہب اور ہماری روایات پر اہل کتاب کے مذہب اور ان کی روایات مسلط کرنے کی ایک سازش ہے۔

قرآن نے اس کا جواب یہ دیا کہ اللہ کو خواہ اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے، جس نام سے بھی اس کو پکارو تمام اچھے نام اسی کے ہیں۔ یعنی مجرد نام کا تعصب قبول حق میں مانع نہیں ہونا چاہیے۔ خدا کے نام اور بھی ہیں اور اس کو اس کے شایان شان ہر نام سے پکارا جا سکتا ہے۔

نماز میں وقار اور سنجیدگی کی تعلیم

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ ...... الایۃ معلوم ہوتا ہے اسی نوعیت کا کوئی اعتراض اسلام کے طریقۂ نماز پر بھی ان ذہینوں کو ہوا۔ مشرکین کے طریقۂ عبادت میں شور و غل اور مکاء و تصدیہ یعنی سیٹی اور تالی وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ برعکس اس کے اسلام میں نماز سنجیدگی اور وقار کا مظہر کامل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نماز کے اس وقار کا جوڑ بھی انھوں نے اہل کتاب سے ملا کر اس کو بھی اعتراض کا بہانہ بنا لیا ہو۔ اس باب میں ہدایت ہوئی کہ نہ تمھاری نمازیں اور دعائیں بہت زیادہ جہری ہوں نہ بالکل ہی سری بلکہ ان کے بین بین کی راہ اختیار کرو۔ یہ اشارہ ہوا اس بات کی طرف کہ تم امت وسط ہو اس وجہ سے تمھاری نمازوں اور دعاؤں میں بھی امت وسط کی شان ہونی چاہیے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا (۱۱۱)

اللہ تعالیٰ کی بلاشرکت غیرے حاکمیت کا اعلان

یہ سورہ کے آخر میں آپ کو خدا ہی کی حمد و تکبیر اور اس کی بلاشرکت غیرے حاکمیت کے اعلان کی ہدایت ہوئی مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس وادی میں چاہیں ٹھوکریں کھاتے پھریں لیکن تم یہ اعلان کر دو کہ شکر کا سزاوار حقیقی وہ اللہ ہے جس نے نہ تو اپنے لیے کوئی اولاد بنائی، نہ اس کی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک و سہیم ہے اور نہ اس کو کبھی ذلت و مقہوریت لاحق ہوتی ہے کہ اس سے بچانے کے لیے اس کو کسی حمایتی اور مددگار کی ضرورت پیش آئے۔ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حمایتی اور مددگار کی ضرورت اس کو پیش آتی ہے جس کو ذلت پیش آنے کا خطرہ ہو۔ جب خدا کی شان ذلت کے ہر شائبہ سے ارفع ہے تو اس کو حمایتی اور مددگار کی کیا ضرورت۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا یعنی اس کی تمام اعلیٰ صفات کا نہایت اہتمام سے اظہار و اعلان کرو، ان مشرکین کے علی الرغم۔

اس سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

لاہور ــــ ۲۷ راپریل ۱۹۷۰ء